مطالعہ پاکستان (ظہوری)

لازمی مضمون

(سائنس، کامرس، جنرل گروپ)

برائے

بارہویں جماعت

ترتیب وتالیف

شیخ آصف اقبال ظہوری

لیکچرار

پاکستان اسٹڈیز

0333-2653460

(01) برصغیر میں مسلم معاشرے کی تشکیل (ص ۰۱)

(02) ہندو اور مسلم معاشروں کا تقابلی جائزہ (ص ۰۲)

(03) دو قومی نظریے کی تعریف (ص ۰۶)

(04) قائداعظم اور نظریۂ پاکستان (ص ۰۹)

(05) علامہ اقبال اور نظریۂ پاکستان (ص ۱۰)

(06) تحریک علی گڑھ اور اس کے اثرات (ص ۱۲)

(07) انڈین نیشنل کانگریس کا قیام (ص ۱۴)

(08) تقسیم بنگال کی تنسیخ اور نتائج (ص ۱۵)

(09) شملہ وفد کی تشکیل و اہمیت (ص ۱۶)

(10) آل انڈیا مسلم لیگ کا قیام (ص ۱۶)

(11) منٹو مورلی ریفارمز (ص ۱۷)

(12) میثاق لکھنؤ (ص ۱۸)

(13) گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1919ء (ص ۱۸)

(14) رولٹ ایکٹ (ص ۱۹)

(15) تحریک خلافت، مقاصد کردار (ص ۲۰)

(16) سائمن کمیشن (ص ۲۱)

(17) نہرو رپورٹ (ص ۲۱)

(18) چودہ نکات اور ان کی اہمیت (ص ۲۲)

(19) خطبہ الہ آباد اور اس کی تاریخی اہمیت (ص ۲۳)

(20) گول میز کانفرنسیں (ص ۲۴)

(21) دستور ہند 1935ء (ص ۲۵)

(22) قرارداد پاکستان - اغراض و مقاصد (ص ۲۶)

(23) کرپس مشن کی سفارشات (ص ۲۷)

(24) کیبنٹ مشن (ص ۲۸)

(25) 3 جون کا منصوبہ (ص ۲۹)

(26) قانون آزادی ہند (ص ۲۹)

(27) قیام پاکستان میں مسلم لیگ کا کردار (ص ۳۱)

(28) تحریک پاکستان میں صوبوں کا کردار (ص ۳۲)

(29) قیام پاکستان کے اغراض و مقاصد (ص ۳۵)

:- برصغیر میں مسلم معاشرے کی تشکیل -: (۱)

برصغیر پاک و ہند اور جزیرہ نمائے عرب کے درمیان زمانہ قدیم سے تعلقات قائم تھے کیوں کہ ساحل سندھ اور جنوبی عرب کے ساحل کے درمیان بہت کم فاصلہ ہے اسی وجہ سے سندھ اور جنوبی عرب کے درمیانی بحری راستوں سے تجارت قدیم زمانے سے جاری و ساری ہے اور ایک لحاظ سے یہ ناگزیر سمجھی جا سکتی ہے کیوں کہ ہندوستان میں نباتات اور دوسری اشیاء پیدا کی جاتی ہیں جن کی عرب ممالک اور جنوبی یورپ کے علاقوں میں بڑی طلب رہی ہے سمندری سفر میں عرب ملاح ماہر تھے اس لیے وہ ساحل سندھ سے ہندوستانی سامان تجارت بڑی کامیابی سے جنوبی عرب کے علاقے یمن کے ساحل تک پہنچا دیتے تھے جہاں سے خشکی کے راستے یہ سامان نہ صرف عرب کے مختلف علاقوں کی منڈیوں میں پہنچا دیا جاتا تھا بلکہ وہاں سے مصر اور جنوبی یورپ کی منڈیوں تک ہندوستانی برآمدات کی ترسیل ہوتی تھی اس قسم کی تجارت طلوع اسلام کے بعد بھی جاری رہی۔ ہندوستانی سامانِ تجارت یمن کے راستے شام تک اور پھر شام کی بندرگاہوں کے ذریعے یورپ تک بھیجنے کا سلسلہ چلتا رہا غرض اس طرح ہندوستان اور عرب کے درمیان بین الاقوامی تجارت ہوتی رہی۔ (عرب تاجر مغربی اشیاء تجارت یعنی یورپی برآمدات کو ہندوستان اور مشرقی ممالک کو بھی لے جاتے تھے) سیلون سے مسلمان بیواؤں اور مسلمان یتیم بچوں کا اخراج شروع ہوا اور سمندری راستے سے بے سہارا لوگ عربستان کی طرف کوچ کرنے لگے۔

اتفاق سے ایک بحری جہاز جس میں مسلمان بیوہ عورتیں اور یتیم بچے عربستان جا رہے تھے سمندری ہواؤں کے رخ بدلنے سے دیبل (بھنبھور بندرگاہ ضلع ٹھٹھہ سندھ) کے قریب پہنچ گیا اس جگہ ان کے جہاز کو مقامی غیر مسلموں نے لوٹ لیا اور عورتوں، بچوں کو قید کر لیا۔ مقامی غیر مسلم یا تو سندھ کے ہندو حکمران راجہ داہر کی بحری فوج سے تعلق رکھتے تھے یا بحری قزاق تھے۔ مسلمان عورتوں اور بچوں کو حکومت سندھ کے زندانوں میں قید کیا گیا تھا۔ کچھ عرب ملاح جو اس جہاز کے لوٹے جانے کے وقت بچ کر سمندری ساحل تک پہنچ گئے وہ طویل سفر کر کے بصرہ کے والی حجاج بن یوسف کے دربار میں پہنچ گئے اور اس گھمبیر واقعہ کی اطلاع حجاج کو دی، حجاج نے بڑے سخت الفاظ میں راجہ داہر کو خط لکھا اور مسلمان عورتوں اور یتیم بچوں کی بہ حفاظت واپسی اور ان سے لوٹے ہوئے مال و اسباب کی بازیابی کا مطالبہ کیا۔ راجہ داہر نے جواب میں یہ عذر پیش کیا کہ وہ اس واقعہ کا ذمے دار نہیں اس پر حجاج بن یوسف نے اپنے داماد اور ۱۷ سالہ بھتیجے محمد بن قاسم کو طلب کیا۔ اور

اور وہ دنیا کی کسی بھی فوج کا سب سے کم عمر فوجی سپہ سالار (جرنیل) تھا سندھ پر حملہ کیلئے تیار کیا اور اس کی قیادت میں 6000 گھڑ سواروں کا لشکر براستہ شیراز (ایران) و مکران (بلوچستان) دیبل کی طرف روانہ کیا (اور فوجی رسد و کمک سمندری راستے سے بھیجی جس میں پتھر پھینکنے والی مشینیں منجنیق بھی کثیر تعداد میں روانہ کیں)۔ یہ 712 عیسوی کا واقعہ ہے محمد بن قاسم اور اس کے لشکر نے راجہ داہر کو دو لڑائیوں میں شکست فاش دی (دوسری لڑائی میں راجہ داہر ہلاک ہو گیا) اور پورا سندھ (اور پنجاب کے علاقے ملتان تک) مسلمانوں کے قبضہ میں آ گیا جس پر پورے عدل و انصاف سے محمد بن قاسم نے چند سال حکومت کی۔

دیگر مسلمان سلاطین کی آمد: جس وقت محمود غزنوی نے ہندوستان پر حملہ کیا اس وقت بھی ہندوستانی (علاقہ سندھ و پنجاب) میں مسلمانوں کی حکومت قائم تھی لیکن وہ فوجی اور مالی اعتبار سے بہت کمزور ہو گئی تھی۔ غزنوی فاتحین (976-1186) اور ان کے جانشینوں (غوری سلاطین) نے جو وسط ایشیاء سے تعلق رکھتے تھے ہندوستان کے شمال مغربی علاقے میں بڑی کامیابی سے حکومت کی۔ یہی وہ علاقہ ہے جو بعد میں مملکت پاکستان کے طور پر دنیا کے نقشہ پر ابھرا (ماسوا بنگال/بنگلہ دیش)۔ تیرہویں صدی عیسوی کے ابتدائی زمانے میں اسلامی حکومت کا دائرہ وسیع ہوتے ہوتے دہلی تک جا پہنچا اور مسلم سلاطین نے جو مختلف خاندانوں سے تعلق رکھتے تھے دہلی پر حکومت کی (دہلی کے حکمران سارے ہندوستان کے حکمراں سمجھے جاتے تھے)۔ 1206-1526ء تک کا دور دہلی سلاطین کا دور حکومت کہلایا۔ پھر وسط ایشیا سے آنے والے ظہیر الدین بابر نے ہندوستان پر حملہ کر کے مقامی مسلم حکمراں ابراہیم لودھی کو پانی پت کے میدان میں تاریخی شکست دی اور ابراہیم لودھی کے ہاتھیوں کے لشکر کو شکست فاش دے کر دہلی میں عظیم اسلامی مغلیہ حکومت کی داغ بیل ڈالی جو 1526-1857ء تک قائم رہی اور ہندوستان پر حکومت کرتی رہی۔

غزنوی حکمرانوں کے دور سے مفتوحہ ہند میں عربی کے بجائے فارسی کو سرکاری زبان قرار دیا گیا اور رفتہ رفتہ مسلمان حکمرانوں نے اپنے زیر تسلط علاقوں میں معاشی، سیاسی اور مذہبی ادارے قائم کئے جن کے لوگوں پر بڑے گہرے اور دیرپا اثرات مرتب ہوئے ریاست کے معاملات اصول شریعت کے مطابق چلانے کا رواج ہوا اور حکمران نفاذِ شریعت کو لازمی گردانتے لگے۔ اس طرح کئی صدیوں تک شرعی قوانین کے مطابق مسلمان حکمران ہندوستان پر حکومت کرتے رہے۔

.....☆.....

ہندو اور مسلم معاشروں کا تقابلی جائزہ

معاشرتی اختلافات: سماجی اعتبار سے ہندو اور مسلم معاشروں میں اختلاف کی وسیع خلیج حائل تھی۔ ہندو معاشرے کی بنیاد ورنا (رنگ) یا ذات کے سخت نظام پر قائم کی گئی تھی جس میں ہندوؤں کے چار طبقات بنائے گئے۔ برہمن، کھشتری، ویش اور شودر جن میں برہمنوں کو سب سے اعلیٰ مقام دیا گیا تھا اور شودروں کو سب سے ادنیٰ یا نیچ مقام پر رکھا گیا تھا اور اچھوت (جن کے لمس یا چھونے سے ناپاکی ہو جاتی ہو) قرار دیا گیا تھا حالانکہ مرنے کے بعد دونوں کے جسم کیڑوں کیلئے یکساں بھرپور غذا فراہم کرتے ہیں۔

ذات کا ہندو فلسفہ ہندوؤں کی سماجی زندگی، عادات و اطوار اور نظریات پر پوری طرح مسلط کر دیا گیا تھا۔ ہندوؤں کو چاروں ذاتوں کے درمیان باہم شادیوں کی اجازت نہیں تھی۔ اور شادی اور موت کے رسم و رواج میں بھی زبردست طبقاتی فرق نمایاں تھا۔ بالائی طبقے کے علاوہ باقی طبقے برادری باہر یا وحشی تصور کئے جاتے تھے اس طرح کے غیر فطری حالات میں ہندو سماج میں مذہبی رواداری اور مساوات کا سرے سے وجود ہی نہ تھا اور اسکے بنیادی اصول انسانیت کے فلسفے کے منافی تھے۔ ہندو دھرم کے ہر طبقے کے لئے تقاریب، موت اور شادی کے رسم و رواج اور روایات منفرد اور علیحدہ نوعیت کے تھے۔ ایک طبقہ سے کسی فرد کی دوسرے طبقے میں تبدیلی ناممکن تھی یعنی ایک طبقہ کا فرد دوسرے طبقہ میں داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ اس طرح ذات کو ہندو دھرم میں ایک ناقابل تبدیلی فعل سمجھا جاتا تھا۔ ایک ایسا معاشرہ انسانی مساوات کو تسلیم کرنے کیلئے نہ کبھی تیار تھا اور نہ آج اسے برداشت کر سکتا ہے۔ ایسی تبدیلی کو ہندو مت کے پیروکار اور خاص کر برہمن ایک قسم کا مذہبی چیلنج سمجھتے ہیں اور اسے روکنے کیلئے ہتھیار اور قوت کے استعمال کو جائز سمجھتے ہیں (اسی بنیاد پر برہمن چھوٹ طبقات کے افراد پر ہر قسم کا ظلم جائز سمجھتے ہیں)۔

اس معاشرے کے مقابلے میں مسلم معاشرے میں انسان کو اللہ تعالیٰ کی اعلیٰ ترین مخلوق یعنی اشرف المخلوقات سمجھا جاتا ہے اور انسانی مساوات کو قانوناً تسلیم کیا جاتا ہے۔ اسلامی معاشرے میں ہر فرد سے ایک خاص معیاری کردار، عمدہ اخلاقی عادات، فہم و فراست، رواداری اور بے لوث خلوص کی توقع کی جاتی ہے۔

مذہبی اختلافات: دولت اور طاقت کو حاصل کرنے کی انسانی خواہش منفی نوعیت کی حامل ہوتی ہے، دولت اور طاقت کے ناجائز

حصول کی خاطر انسان کی حق تلفی اور استحصال کا ارتکاب کرتا ہے۔ ہندو مت میں اس ناجائز خواہش کی تکمیل کیلئے ورنا کا اصول اپنایا گیا تھا اور خواہش کو باقاعدہ طور پر مذہبی تحفظ فراہم کیا گیا تھا جس کے تحت سماج کے اچھوت اور غیر اچھوت پاک اور ناپاک طبقات میں تقسیم کر دیئے گئے تھے۔ دولت (لکشمی دیوی) اور طاقت (وشنو دیوتا) کی باقاعدہ پرستش کو رائج کیا گیا تھا۔ ایسا معاشرہ جس میں دولت اور طاقت کو سرمایہ حیات تصور کیا جائے اور انسانی عدم مساوات اور انسانی قربانی کو جائز سمجھا جائے تو وہ چاہے کتنا ہی مذہبی کیوں نہ ہو اس میں مذہب کی تعلیمات انسانوں سے نفرت کے اصول پر مبنی ہوتی ہیں۔

اسلام بطور مذہب توحید کی دعوت دیتا ہے جس میں ایک خدا کی پرستش اور انسانوں کو مساوات کی تعلیم دی جاتی ہے۔ سارے مسلمانوں کو سیاسی، معاشی اور قانونی لحاظ سے برابر کے حقوق کا حقدار سمجھا جاتا ہے جس میں رنگ، نسل اور جغرافیائی لحاظ سے کوئی تفریق نہیں کی جاتی اور سب کے ساتھ یکساں سلوک کرنے کی تعلیم دی جاتی ہے۔

سیاسی اختلافات: امت مسلمہ کو ایک جسم کی حیثیت حاصل ہے اس میں امت کے سارے افراد کو مساوی سیاسی حقوق حاصل ہیں۔ اس کے علاوہ اس میں حکمرانوں کا احتساب کرنے اور سزا اور جزا کے سخت قوانین موجود ہیں جبکہ ہندو معاشرے میں دنیا کو "مایا" سمجھا جاتا ہے جس کے معنی سراب کے ہیں۔ اس نظریہ کے تحت ہندو دولت کی پرستش کی طرف راغب ہوتے ہیں اور برہمن حکمران سیاسی اقتدار اور فیصلہ سازی کے سارے اختیارات رکھتے ہیں وہ خدا سمجھے جاتے ہیں اور ان کے اعمال کا کوئی احتساب نہیں کیا جاتا۔

تصوراتی اختلافات: ہندو مذہب کے پیروکاروں کیلئے جنگ دامن ذاتی تحفظ والا کیلئے ہوتے ہیں۔ ان کا مقصد چھوٹی ذات کے ہندوؤں کو غلام بنا کر ان کے بنیادی حقوق غصب کرنا ہوتا ہے۔ اس طرح معاشرے کے ایک بڑے حصہ کا استحصال جائز سمجھا جاتا ہے۔ (جو مہذب معاشرہ کے تصور کے قطعی منافی ہے)

اس کے برخلاف مسلم معاشرے میں جنگ و امن کا انحصار اللہ تعالیٰ کی خوشنودی پر منحصر ہوتا ہے اور معاشرے کا بنیادی مقصد اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کا قیام ہوتا ہے جس میں بنی نوع انسان کا غلامی سے نجات دلانا، بنیادی حقوق فراہم کرنا، سماجی و قانونی مساوات کو یقینی بنانا، سب کے ساتھ انصاف کرنا وغیرہ جیسے نیک اوصاف کو فروغ دیا جاتا ہے تاکہ معاشرہ کے مقتدر اور طاقتور افراد معاشرے کے کمزور اور ناتواں افراد کا استحصال نہ کر سکیں۔ اس طرح اسلامی معاشرہ کا بنیادی تصور انسان دوستی اور نیکی پر مبنی ہوتا ہے اور اسکی نوعیت فلاحی ہوتی ہے جب کہ ہندو معاشرہ ظلم و تشدد، حق تلفی اور غرباء کے استحصال کو جائز خیال کرتا ہے۔

ثقافتی اختلافات: ہندو معاشرہ اور اسلامی معاشرے دو انتہائی مختلف ثقافتوں کے حامل ہیں۔ ان کے ڈھانچے اور خدوخال بنیادی طور پر ایک دوسرے سے متضاد ہیں۔ انکے پیروکار کبھی مشترکہ معاشرہ تشکیل نہیں دے سکتے۔ ان کے رہن سہن کے طریقے مذہبی عقیدے، رسم و رواج اور روایات میں مشرق سے مغرب تک کا فاصلہ ہوتا ہے۔ مسلمانوں کی عمومی زبان اردو ہے اور اس کا ثقافتی ورثہ اور ادب ہندوؤں کی زبان ہندی اور سنسکرت ادب سے بالکل جداگانہ ہے۔ اردو میں کثرت سے فارسی اور عربی کے الفاظ موجود ہیں جب کہ ہندی میں سنسکرت کے الفاظ کی بھرمار ہے۔

ہندوؤں اور مسلمانوں کے فلسفے اور ان کی تاریخوں میں بھی بہت زیادہ فرق ہوتا ہے۔ مسلمان فاتحین کو ہندو وحشی حملہ آور قرار دیتے ہیں۔ جب ہندو اپنے ماضی کی طرف نظر دوڑاتے ہیں تو وہ کوٹلیا (ارتھ شاستر کے مصنف) سے رجوع کرتے ہیں جب کہ مسلمان الفارابی کو آواز دیتے ہیں۔ دونوں معاشروں کا فلسفہ حیات اور ان کا فلسفیانہ ماضی کا ماحول اس قدر متضاد ہے کہ ہندو مسلمان کسی مشترکہ سماجی یا گروہی پرچم یا چھتری کے نیچے باہم یکجا نہیں ہو سکتے اور وہ ایک معاشرتی وحدانیت سے وابستہ نہیں ہو سکتے۔ در حقیقت نہ صرف ہندو اور مسلم معاشرے ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں بلکہ ان کی ثقافتیں اور تہذیبیں بھی جداگانہ ہیں۔

ہندو معاشرے پر اسلام کے اثرات: ہندو معاشرہ صدیوں سے ذات پات کے فرسودہ نظام کے تحت چل رہا ہے جس میں ایک طاقتور اعلیٰ ذاتی طبقہ جو برہمن کہلاتا ہے پوری طرح اقتدار پر قابض ہے۔ برہمن چھوٹی ذاتوں کے ہندوؤں کا استحصال کر رہا ہے اور ان کے بنیادی انسانی حقوق کو غصب کئے ہوئے ہے یہی وجہ ہے کہ اس معاشرہ کی شان و شوکت اور افادیت پوری طرح ختم ہو چکی ہے۔ اس تنگ نظری پر مبنی معاشرے کو نہ آج پسند کیا جاتا ہے نہ ماضی میں نچلی ذات کے ہندوؤں کیلئے قابل قبول تھا نہ اس وجہ سے معاشرہ سیاسی اور معاشرتی اعتبار سے مستقل بنیادوں پر چار ذیلی معاشروں میں تقسیم ہو گیا تھا اور ہندو معاشرتی اور فوجی اعتبار سے بہت کمزور ہو گئے تھے۔ جب مسلمانوں نے ہندوستان پر حملہ کیا تو وہ بڑی آسانی سے مغلوب ہو گئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اسلام کی

ایک طاقتور تحریک کے بندھن میں باندھ دیا اور کمزوروں کو ہر قسم کی بدعنوانیوں اور استحصال سے نجات دلائی۔ اسلام نے مہذب دنیا میں ایک مظبوط اخلاقی اور دانشورانہ قیادت کی داغ بیل رکھی۔ مسلمانوں کے اس اعلیٰ معاشرتی نظام اور اعلیٰ اوصاف کے ہندوؤں پر گہرے اثرات مرتب ہوئے اور ہندو معاشرہ میں اصلاح کا پہلو پیدا ہوا۔ انکے معاشرتی کردار میں زبردست تبدیلی رونما ہوئی اور پہلی بار صدیوں کے بعد ہندوؤں میں انسانی مساوات کا تصور پیدا ہوا۔

مذہب پر اثرات: اسلام کا ہندو دھرم پر خاطر خواہ اثر پڑا اور اس کے دور رس نتائج نکلے۔ قرون وسطیٰ کی ہندو دینیت، بھگتی تحریک کا فروغ، ذات پات کے بندھنوں کا کمزور پڑنا سب اسلام کے واضح اثرات کا نتیجہ تھے۔ انسانیت سوز مظالم (انسانی قربانی، ستی کی رسم اور مذہبی بھجن وغیرہ سننے پر نچلی ذات کے لوگوں کے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ ڈالنے کا قاتلانہ طریقہ وغیرہ) کا بھی خاتمہ ہوا۔ ہندو مذہب کے پیچیدہ عقائد، تصورات، فرسودہ رسم و رواج کے مقابلے میں اسلامی عقیدہ، طرز معاشرت، انسانی بھائی چارہ، قانونی و معاشرتی مساوات وغیرہ پر مبنی انسانی سلوک اور اس کی واضح تعلیمات نے ہندوؤں کو نہ صرف اس طرف راغب کیا بلکہ خود ہندو دھرم کے سخت اور ظالمانہ رویہ کی خاطر خواہ اصلاح ہوئی۔

اسلامی تصورات سے ہندوؤں کے اکابرین، زعماء، مذہبی پیشوا اور مفکرین بھی بے حد متاثر ہوئے۔ انہوں نے اپنی غیر انسانی تنگ نظری کو دور کر کے اس کی جگہ محبت، بھائی چارے، مساوات اور خدا کی وحدانیت کے اسلامی اصولوں میں دلچسپی لینا شروع کر دی۔ (اگر چہ کہ وہ کثیر المعبودیت اور بت پرستی اور ذات پات کی غیر انسانی تقسیم کو یکسر ختم نہ کر سکے)۔ اس اسلامی اثر نے بھگتی تحریک کی راہ ہموار کی جس سے اسلامی اعلیٰ انسانی اوصاف اور تعلیمات کے مطابق ہندو دھرم کے عقائد میں اصلاح کا کام شروع ہوا۔ اس تحریک کو ماننے والوں نے مذاہب کے تشخص، خدا کی وحدانیت، انسانی بھائی چارے اور پیدائش کے بجائے عمل کی بنیاد پر عزت کے اصولوں کی ترویج کی۔ انہوں نے ذات پات کی تفریق اور طبقاتی نفرت رقابتوں، تعصبات اور پجاریوں (برہمنوں) کی بالادستی کے خلاف احتجاج کرنا شروع کر دیا اور کچھ ایسا طریقہ اختیار کیا کہ عام لوگوں میں یہ تاثر پیدا کیا جائے کہ ہندو مذہب اور اسلام کی بنیادیں دراصل ہم آہنگ ہیں مثلاً انہوں نے اپنے بھجنوں اور مذہبی گیتوں میں رام اور رحیم، کیشو اور کریم، کعبہ اور کلیسا اور قرآن اور پران کا ایک ساتھ ذکر کرنا شروع کر دیا۔ آٹھویں تا سولہویں صدی کے دورانیہ میں بھگتی تحریک کو کافی فروغ حاصل ہوا اور ہندوؤں کی بڑی تعداد بھگتی تحریک سے بڑی حد تک متاثر ہوئی اس تحریک کے رہنماؤں میں شنکر اچاریہ، رامانج، رامانند، چیتنیہ، نام دیو، کبیر اور بابا گرونانک (سکھ مذہب کے بانی) نے خاص طور پر بڑی شہرت پائی۔

سیاسی و سماجی نظام پر اثرات: جب مسلمان برصغیر میں فاتحین کی حیثیت سے داخل ہوئے تو اس وقت ہندوؤں کا سابقہ ایک ایسی قوم سے پڑا جس کا سماجی نظام ہندوؤں کے ذات پات کے نظام سے بالکل متضاد اور مختلف تھا۔ ہندوؤں (خاص کر برہمنوں) کو یہ نظام ان کے اقتدار کے خاتمہ کا باعث نظر آیا اس لئے انہوں نے مسلمانوں کے سماجی نظام کی جس کی بنیاد فطرت اسلام تھی سخت مخالفت کی اور ہر طرح سے اس کی تبلیغ کی مزاحمت کی لیکن یہ مزاحمت صرف اعلیٰ طبقے کے ہندوؤں ہی تک محدود تھی جو برہمنوں پر مشتمل تھا جنہوں نے اپنی بالادستی اور اقتدار کو قائم رکھنے کیلئے ایک انتہائی پیچیدہ غیر انسانی ظالمانہ ذات پات کا نظام قائم کر رکھا تھا اور جبر و تقدس پر مبنی سیاسی ڈھانچہ قائم کر رکھا تھا جس سے چھوٹی ذات کے سارے ہندو نالاں تھے جن کا بری طرح استحصال ہو رہا تھا اور جن کے انسانی حقوق کو غصب کر لیا گیا تھا۔ غالباً کسی نجات دہندہ کے منتظر تھے۔ جیسے ہی انہیں دعوت اسلام ملی وہ اسلام کی طرف راغب ہو گئے۔ لیکن برہمنوں نے سر توڑ کوشش کر کے بڑی تعداد میں چھوٹی ذات کے ہندوؤں کو مشرف با اسلام نہیں ہونے دیا اور انہیں مسلمانوں سے ہمیشہ علیحدہ اور دور رکھا اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہندوستان میں دو مختلف اور متضاد سماجی نظام ایک دوسرے کے مد مقابل زندگی گزارتے رہے اور ہندوستان کی آبادی مستقل طور پر دو طاقتور اکائیوں کی آماجگاہ بنی رہی اور یہی دو متصادم سماجی نظام تھے جس سے ہندوستان میں دو قومی نظریہ کی ابتداء ہوئی۔

ہندوستان پر مغلیہ سلطنت کی گرفت مظبوط تھی اس دور میں اسلامی تعلیمات کی تبلیغ بڑے پیمانہ پر جاری رہی۔ اسلامی نظام کے گہرے نقوش مقامی آبادی پر مرتب ہوئے۔ نئی جنگی تربیت کو فروغ حاصل ہوا۔ جنگی حکمت عملیوں میں خاطر خواہ تبدیلیاں متعارف ہوئیں اور نئے نئے ہتھیار خاص کر آتشیں اسلحہ، بندوقیں اور توپیں وغیرہ فوجی اغراض کیلئے استعمال ہونے لگیں۔ پوری فوجی تنظیم، فوجی تربیت کے نظام اور نئے نئے ہتھیاروں کے استعمال سے ملک کے عسکری نظام میں انقلابی ترقی ہوئی۔ تلوار، برچھے اور کلہاڑیاں وغیرہ کی جگہ جدید اسلحہ سے لیس مسلح فوج مسلم حکمرانوں کی طاقت کا سرچشمہ بنی اور ایک بنیادی دفاعی ادارہ کی حیثیت سے ابھری۔

تہذیب وثقافت پر اثرات: ہندوستان میں رائج ہندو ذات پات کے نظام پر اسلامی تہذیب وثقافت کے گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ ہندوؤں کو آزادی خیال اور اس کے اظہار کا موقع ملا۔ وہ انسانی عظمت، عالمی بھائی چارہ اور یکساں سماجی حقوق کے نظریہ سے واقف ہوئے۔ اسلام کے ان سنہری اصولوں سے واقفیت ہونے سے ہندو ثقافت میں نمایاں تبدیلیاں پیدا ہونا شروع ہوگئیں۔ ہندوؤں کے ذات پات پر مبنی تعلیمی نظام میں صرف برہمنوں کو تعلیم حاصل کرنے کے مواقع حاصل تھے اور نچلی ذات کے ہندوؤں کو عملی طور پر تعلیم سے محروم رکھا گیا تھا۔ مسلمانوں نے ہندوؤں کو عام تعلیم کا تحفہ دیا جس کا ان کے پاس پہلے کوئی تصور نہ تھا۔ اس کے علاوہ انسانی قربانی اور ستی کی رسم کی مسلمانوں نے حوصلہ شکنی کی اور ہندوؤں پر یہ بات واضح کی کہ سزا وجزا کا تعلق انسان کے اچھے اور برے اعمال سے ہوتا ہے اور اس کا انحصار مخصوص طبقہ میں پیدائش پر نہیں ہوتا یعنی یہ سوچ غلط ہے کہ اعلیٰ ذات میں پیدائش ہی نجات کی ضامن ہے اور یہ کہ چھوٹی ذاتوں میں پیدا ہونے والے نجات سے محروم رہیں گے جیسا کہ ہندو پنڈتوں نے مشہور کر رکھا تھا۔ غرض اسلامی نظریات اور تصورات رفتہ رفتہ ہندو مذہب کے نظریات اور تصورات پر حاوی ہوتے گئے اور نچلی ذات کے ہندو برہمنوں کی عائد کردہ مصنوعی مذہبی طبقاتی بندشوں کی اصلیت سے واقف ہوگئے اور ان کو جھوٹ اور غلط سمجھنے پر مجبور ہوگئے۔

ہندوستانیوں کے لباس، خوراک، اجتماعات، شادی بیاہ کی تقاریب، عدالتی نظام وغیرہ پر بھی اسلامی ثقافت کے گہرے اور دیرپا اثرات مرتب ہوئے۔ مثلاً لباس میں اچکن اور شلوار کو شمالی ہند کے ہندوؤں میں بڑی مقبولیت حاصل ہوئی جو خالصتاً اسلامی طرز کے لباس ہیں اس کے علاوہ ہندوؤں میں شکار کرنے، پولو کھیلنے اور باز کے استعمال سے شکار کرنے اور دوسرے متفرق کھیل وغیرہ بھی اسلامی نوعیت کی حامل مصروفیات تھیں جو ہندوؤں میں بڑی مقبول ثابت ہوئیں۔ فن باغبانی میں ایک قسم کی یکسانیت، توازن اور اس کے نت نئے طریقے بھی اسلام ہی نے متعارف کرائے۔

مسلمان ہندوؤں سے بہتر سماجی ومعاشی حیثیت کے حامل تھے انہیں دیکھ کر ہندوؤں میں نئے نئے فیشن متعارف ہوئے۔ مسلمانوں میں شاندار قسم کی دعوتوں کا اہتمام ہوتا تھا جن میں سو سے زیادہ کھانے دسترخوانوں پر چنے جاتے تھے ابوالفضل نے مسلمانوں کے متعارف کئے ہوئے کھانوں کی ایک فہرست اپنی تصنیف آئین اکبری میں دی ہے ان میں سے چند مشہور مغل دور کے کھانے مثلاً پلاؤ، قورمہ، شیرمال، زردہ، بریانی اور مختلف اقسام کے کباب آج بھی بے حد مرغوب کھانوں میں شمار ہوتے ہیں

زبان اور ادب پر اثرات: ہندوستان میں جو مسلمان فاتحین پہلے داخل ہوئے وہ عربی بولتے تھے۔ ان کے بعد ترکی بولنے والے اور پھر فارسی بولنے والے یکے بعد دیگرے ہندوستان میں داخل ہوئے۔ لہذا بعد میں مسلمانوں میں عربی زبان مذہبی تعلیمات کیلئے مخصوص ہوکر رہ گئی۔ فارسی زبان کو درباری اور عدالتی زبان بننے کا موقع ملا۔ اس لئے سرکاری ملازمتوں کے خواہش مند ہندو اور مسلمان فارسی زبان سیکھنے لگے لیکن پھر بھی فارسی عمومی زبان کا درجہ حاصل نہ کرسکی مقامی ہندوستانی زبان برج بھاشا، عربی، فارسی اور ترکی زبانوں کے امتزاج سے ایک نئی زبان کی تخلیق عمل میں آئی جو اردو کہلائی۔ اسلام کے اثرات مقامی زبانوں پر بھی مرتب ہوئے اور ان زبانوں کو بھی بڑی ترقی حاصل ہوئی۔ تیرہویں صدی کے اختتام تک ہندوؤں کی قدیم اور مذہبی زبان سنسکرت بہت ہی محدود ہوکر رہ گئی۔ لیکن دوسری زبانوں نے مسلم دور حکومت کی خوش حالی اور امن وامان سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کافی ترقی کی اور ہر زبان میں ادبی سرگرمیاں عروج تک پہنچ گئیں۔ پورے ملک میں مقامی ادب نے تیزی سے فروغ پانا شروع کیا۔ بنگالی، مراٹھی، سندھی اور پنجابی میں بڑے پیمانے پر تصنیف وتالیف کا کام ہوا۔

فنون لطیفہ اور فن تعمیرات پر اثرات: مسلمانوں نے ہندوستانی فنون لطیفہ اور فن تعمیر پر بڑے گہرے اثرات مرتب کئے۔ ہندو اور مسلم ماہر فنون اور ماہر تعمیرات کے درمیان روابط استوار ہوئے تو ہندوستان میں اس وقت مروجہ فنی طریقوں میں جدیدیت کا پہلو نمایاں ہوا اور ایک نئے فن تعمیر "ہندو اسلامی شعبہ فن تعمیر" (انڈو اسلامک اسکول آف آرکیٹکچر) کی داغ بیل پڑی۔ اس سے یہ تبدیلی واقع ہوئی کہ قدیم ہندوستانی فن تعمیر میں مضبوطی اور شان وشوکت کے ساتھ ساتھ اسلامی فن تعمیر کے اوصاف مثلاً کشادگی اور سادگی بھی شامل ہوگئے۔ (12) فتح پور سکری کے محلات، دہلی کا لال قلعہ اور تاج محل اس نئے فن تعمیر کے شاندار نمونے ہیں۔

دہلی کے مسلم سلاطین کے دور میں مسلمان فن آرائش ونقش ونگار کو کافی ترقی ملی۔ ان کے زمانہ میں خطاطی اور عربی نقش ونگار کو بھی کافی ترقی ہوئی۔ انواع واقسام کے بیل بوٹے اور ہندسی (جیومیٹری) اشکال تخلیق ہوئے اور کتابوں کی تزئین اور فن تعمیر میں ان کا استعمال کتابوں اور عمارتوں میں خوبصورتی کا اضافہ کرنے میں معاون ثابت ہوا خاص طور پر عربی خطاطی کی خوبصورتی میں بے حد اضافہ ہوا۔ مسلمانوں نے فن مصوری کو بھی بام عروج تک پہنچایا۔ اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ شاہی محلات کی زیبائش وآرائش میں

تصاویر کا بھی باقاعدہ استعمال ہوتا تھا۔ گو کہ صحیح عقائد پر عمل پیرا مسلمان اس کو ناپسندیدہ نظروں سے دیکھتے تھے کہ مسلمان موسیقی کی ترویج میں حصہ لیں لیکن اس کے باوجود موسیقی اسلامی دور میں کافی فروغ پاتی رہی۔

تاریخ پر اثرات: ہندوستان میں تاریخ نویسی کا کوئی باقاعدہ طریقہ کار رائج نہ تھا جبکہ مسلمانوں میں تاریخ نویسی ابتدائے اسلام سے ہی رائج رہی اس لئے جب وہ ہندوستان میں داخل ہوئے تو تاریخ نویسی کو ہندوستان میں متعارف کرایا۔ ہندو دیومالاؤں کی داستانوں کی جگہ ایک منظم طریقہ سے حالات پر مبنی واقعات کو تاریخ کی شکل میں لکھنے کا طریقہ عام ہوا۔ ہندوؤں میں واقعات کی تاریخیں لکھنے کا رواج نہ تھا اس کے برخلاف عرب مسلمان جہاں جہاں بھی تاجروں اور فاتحین کی حیثیت سے دنیا کے مختلف ممالک میں پہنچے تو وہاں انہوں نے اہم حالات و واقعات اور سماجی تبدیلیوں کو باقاعدہ تاریخ وار قلمبند کرنے کا طریقہ رائج کیا۔ اسی انداز میں جب مسلمان ہندوستان میں وارد ہوئے تو یہاں ظہور پذیر ہونے والے واقعات اور سماجی تبدیلیوں وغیرہ کے بارے میں خود نوشت سوانح عمری لکھنی شروع کر دیں جو اس دور کے تاریخی واقعات کے بارے میں مستند مواد فراہم کرتی ہیں (تزک بابری، تزک جہانگیری اور آئین اکبری وغیرہ اس کی عمدہ مثالیں ہیں)۔ ہندو مصنفین نے بھی یہی طریقہ کار اپنالیا اور تاریخی ادب میں دیومالائی داستانوں کے بجائے حقیقی واقعات کو قلمبند کرنے کا اسلوب اختیار کیا۔ فارسی زبان کے دوش بدوش ہندوؤں کی کلاسیکی زبان سنسکرت نے بھی مسلمانوں کے دور میں ترقی کی۔

دوقومی نظریہ کی تعریف

برصغیر کے مسلمانوں کے حوالہ سے دوقومی نظریہ دراصل امت مسلمہ کا وہ تصور ہے جس کی صراحت قرآن کریم میں موجود ہے۔

وکذلك جعلنكم امة وسطا لتكونو شهدآء على الناس ويكون الرسول عليكم شهيدا ط

(قرآن البقرہ:143)

ہم نے تم (مسلمانوں) کو متوازن امت بنایا ہے تاکہ تم عالم انسانیت (کے اعمال) پر شاہد ہو اور (تمہاری مرکزیت کے امین) رسول تمہارے اعمال پر شاہد رہیں۔ اس کے علاوہ قرآن کریم میں یہ بھی ارشاد ہوا۔

كنتم خير امة اخرجت لناس تامرون بالمعروف وتنهون عن المنكر وتومنون بالله ط

(قرآن سورۃ آل عمران 110)

تم دنیا میں ایسی بہترین امت ہو جسے انسانوں کی ہدایت و اصلاح کیلئے میدان عمل میں لایا گیا ہے تم لوگوں کو مؤثر طور پر نیکی کی راہ دکھاتے ہو اور بدی کی راہ سے روکتے ہو اور یہ اس لئے کہ تم اللہ تعالیٰ کی ذات پر حقیقی ایمان رکھتے ہو۔

مشہور مؤرخ البیرونی نے ہندو اور مسلم معاشرے کے فرق کو اس طرح بیان کیا "ہندو مسلمانوں سے ہر اعتبار سے مختلف ہے۔ ان (ہندوؤں) کے تمام تعصبات کا رخ ان لوگوں کے خلاف ہے جو ان جیسے نہیں۔ یعنی تمام غیر ملکی (مسلمان) وہ انہیں ملیچھ یعنی ناپاک کہتے ہیں اور ان کے ساتھ ہر قسم کے تعلق کو گناہ سمجھتے ہیں خواہ باہمی شادیاں ہوں اور کسی بھی قسم کا تعلق یا ان کے ساتھ نشست و برخاست ہو یا کھانا پینا، کیونکہ ان کے خیال میں ایسا کرنے سے وہ آلودہ ہو جائیں گے"

ہندو معاشرے نے صدیاں گزر جانے کے باوجود اپنا یہ کردار برقرار رکھا۔ ہندو مسلم معاشرہ ہمیشہ دو ایسی ندیوں کے مانند رہے جو کبھی بھی ایک دوسرے کو چھو تو لیتے تھے لیکن ایک دوسرے میں کبھی ضم نہیں ہوئے بلکہ دونوں جداگانہ راستے برقرار رکھے۔

سرسید احمد خان ہندوستان میں وہ پہلے مفکر تھے جنہوں نے مسلمانوں کو 1867 میں ایک علیحدہ قوم قرار دیا تھا چنانچہ ہندوؤں نے انہیں سخت ناپسند کرنا شروع کر دیا تھا حالانکہ ہندوؤں کو ان کا شکر گزار ہونا چاہئے تھا کیونکہ سرسید احمد خان ہی وہ آدمی تھے جنہوں نے برطانوی حکمرانوں کے ذہن اس طرف رجوع کرائے کہ جب تک ہندوستانیوں کو ہندوستان کی انتظامیہ میں شامل نہیں کیا جائے گا 1857 کی بغاوت جیسے واقعات کا اعادہ ہوتا رہیگا۔

بیسویں صدی کی تیسویں دہائی کے اوائل میں علامہ محمد اقبال کی شمال مغربی ہند کے علاقوں پر مشتمل ریاست کی تجویز کو مسلم اکابرین اور زعماء نے قابل اعتناء سمجھا تھا تاہم وہ مسلمانوں کے شعور کو بیدار کرنے میں ضرور کامیاب ہوئے تھے تاہم اس دہائی کے وسط اور اواخر میں اقبال کی یہ تجویز مسلم ریاست کا رخ متعین کرنے میں کامیاب ہوگئی۔

دوقومی نظریہ کی اہمیت

: ہندوؤں اور مسلمانوں کے سوچنے کا انداز ان کی طرز ہائے زندگی باہم متصادم اور متضاد رہی ہیں ان کو مدنظر رکھتے ہوئے دوقومی نظریہ کی اہمیت مختصراً یوں بیان کی جاسکتی ہے۔

۱۔ مسلمان اس حقیقت سے آشنا ہو چکے تھے کہ وہ ایک علیحدہ قوم ہیں اب کسی نام نہاد ہندوستانی قومیت میں وہ خود کو ضم کر کے اپنی شناخت کھونا نہیں چاہتے تھے۔

۲۔ مسلمانوں کو اس بات کا احساس ہو گیا تھا کہ وہ ہندوستان میں ایک بڑے گروہ کی حیثیت رکھتے ہیں کیونکہ گیارہ میں سے چار صوبوں میں ان کی اکثریت تھی، ان کی آبادی 90 ملین تھی جس کو صورت میں بھی اقلیت خیال کرنا درست نہ تھا۔

۳۔ مسلمانوں کا دعویٰ تھا کہ انہیں اپنی آبادی کے تناسب سے اقتدار میں شراکت کا پورا پورا حق حاصل ہے اور وہ اقتدار میں اپنے حصے سے کسی صورت میں دستبردار ہونے کیلئے تیار نہ تھے۔

۴۔ مسلمانوں کو اچھی طرح اس بات کا اندازہ ہو گیا تھا کہ اقلیتوں کے تصور کے مطابق وہ ہرگز ایک گروہ نہیں تھے چنانچہ انہوں نے ہندوستان کے شمال مشرقی اور شمال مغربی حصوں میں اپنا ارتکاز کیا تا کہ ان خطوں کو اپنی ایک آزاد مملکت کے سانچے میں ڈھال سکیں۔

۵۔ مسلمان اس بات پر متفق تھے کہ مغربی جمہوریت، ہندوستان کیلئے مناسب نہیں کیونکہ یہاں دو قومیں ہیں، جن میں سے ایک اکثریت اور دوسری اقلیت ہے۔ متحدہ ہندوستان کے قیام کی صورت میں اقتدار ہمیشہ کیلئے ہندوؤں کے ہاتھ میں چلا جاتا جو مسلمانوں کے مفاد کے خلاف تھا۔

۶۔ مسلمانوں نے کانگریسی وزارتوں کے دور میں 1939-1937 سے سبق حاصل کر لیا تھا جس میں گاندھی کے فلسفے کے مطابق ودیا مندر اور وار دھا اسکیم کی تعلیمی پالیسی نافذ کی گئی تھی۔ بندے ماترم کو قومی ترانہ کی حیثیت دی گئی تھی اور اردو کی جگہ ہندی کو عدالتی زبان بنایا گیا تھا اور اسے ترقی دینے کی پالیسی پر عمل کیا جا رہا تھا۔ ایسے وقت مسلم لیگ نے ایک عوامی مہم چلائی اور ہندوستانی مسلمانوں کو یہ یقین دلایا کہ کانگریس مسلمانوں کی سیاسی حیثیت اور ان کے فکر و عمل کو تباہ کرنے کے درپے ہو گئی ہے اور خالصتاً ہندو تہذیب اور ہندو ثقافت کو فروغ دینے اور اس کی تعمیر نو میں مصروف ہے۔

چنانچہ دوقومی نظریہ تحریک پاکستان کی بنیاد بن گیا اس نظریہ کے تحت تشکیل پاکستان کیلئے ہندوستانی مسلمانوں کو حکومت برطانیہ اور ہندو اکثریت کی طرف سے شدید مخالفت کا سامنا کرنا پڑا اور قائداعظم کے شعور اور سخت محنت کی وجہ سے مسلمانوں کی کثیر تعداد ان کی حامی ہو گئی اور 14 اگست 1947 کو پاکستان عالم وجود میں آیا۔

دوقومی نظریہ کے ارتقاء اور تشکیل پاکستان کی صورتیں:

سندھ کے فاتح اول محمد بن قاسم کی آمد اور بعد ازاں شیخ احمد سرہندی (وفات 1626) شاہ ولی اللہ (وفات 1762) جمال الدین افغانی (وفات 1897) سرسید احمد خان (وفات 1898) کے افکار اور اعمال کو تشکیل پاکستان کی بنیاد تصور کرتے ہیں لیکن 8 مارچ 1944 کو علی گڑھ یونیورسٹی کے طلباء سے خطاب کرتے ہوئے قائداعظم نے فرمایا کہ جس دن پہلے مسلمانوں نے برصغیر میں قدم رکھا اور پہلا ہندو مسلمان ہوا تھا پاکستان اسی دن وجود میں آ گیا تھا۔ تقسیم برصغیر کو مسلمانوں اور ہندوؤں کے مابین ناقابل تنسیخ اختلافات کا ناگزیر نتیجہ قرار دیا جاتا ہے۔

1879 میں مشہور پان اسلامزم کے مفکر جمال الدین افغانی نے ایک ایسی مسلم جمہوریت (ریپبلک) کے بارے میں اظہار خیال کیا جس میں وسط ایشیائی ریاستیں، افغانستان اور برصغیر کے مسلم اکثریتی علاقے شامل تھے۔ سرسید احمد خان وہ پہلے شخص تھے جنہوں نے اس حقیقت پر زور دیا کہ ہندوستان ایک ملک نہیں بلکہ براعظم ہے۔ ایک اور نامور مصنف مولانا عبدالحلیم شرر نے 23 اگست 1890 کو اپنے ہفتہ وار رسالہ "مہذب" کے اداریے میں اپنے نظریات کا اظہار کیا تھا انہوں نے بیان کیا کہ "اب ایسا وقت آ گیا ہے کہ ایک قوم کی مذہبی رسومات دوسرے کے جذبات کو مجروح کئے بغیر ادا نہیں کی جاسکتیں اور نا ہی بے عزتی کو برداشت کرنے کا عنصر پایا جاتا ہے۔ جب چیزیں اس نہج پر پہنچ جائیں تو عقلمندی کا تقاضہ یہی ہے کہ ہندوستان کو ہندو اور مسلمان صوبوں میں تقسیم کر کے تبادلہ آبادی کر دیا جائے"

اکتوبر 1917 کو سوشلسٹ انٹرنیشنل کی اسٹاک ہوم کانفرنس میں خیری برادران، ڈاکٹر عبدالجبار خیری اور ان کے چھوٹے بھائی پروفیسر عبدالستار خیری نے ہندوستان کی ہندو اور مسلمانوں کے درمیان تقسیم کی تجویز پیش کی تھی۔ اپریل 1920 میں محمد عبدالقادر

[illegible] کانگریس کے نام ایک [illegible] شائع کی [illegible] ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین [illegible] کہ
[illegible] پاکستان اور [illegible]
[illegible] لالہ لاجپت رائے [illegible]
شائع ہوئے۔ دسمبر 1921 میں احمد آباد میں ہونے والے آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس میں [illegible]
مسلمانوں کے [illegible] کے نام سے [illegible]
[illegible] مسلمانوں [illegible] 1924 میں انہوں نے ہندوستان کو

مندرجہ ذیل تجاویز دیں:

1. مستقبل کی آزادی [illegible] (ہندو مسلم) [illegible]
2. مسلم اکثریتی صوبوں کی مسلم ریاستیں اور ہندو اکثریتی صوبوں کی ہندو ریاستیں تشکیل دی جائیں۔
3. ان ریاستوں کو ملا کر ہندوستانی وفاق کی تشکیل [illegible] ہندوؤں اور مسلمانوں [illegible] حکومت کے تحت [illegible]

1923 میں حکومت ہند نے شمال مغربی سرحدی کمیٹی کا تقرر کیا۔ اس کمیٹی کو یہ ذمہ داری سونپی گئی کہ وہ صوبہ سرحد کے اضلاع اور قبائلی علاقے کے مابین انتظامی تعلقات اور صوبہ سرحد کو پنجاب میں ضم کرنے کے معاملہ پر رپورٹ تیار کرے۔ اسلامی انجمن ڈیرہ اسماعیل خان کے صدر سردار گل خان نے کمیٹی کے روبرو 1924 میں بیان دیتے ہوئے کہا "ہندو مسلم اتحاد کبھی حقیقت کا روپ نہیں اختیار کر سکتا اس کے بجائے ہم ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین علیحدگی کا مطالبہ کر سکتے ہیں۔ جنوب میں 23 کروڑ ہندو اور شمال میں 3 کروڑ مسلمان رہتے ہیں۔ راس کماری سے آگرہ تک کا علاقہ ہندوؤں کو دے دیجئے اور آگرہ سے پشاور تک کا علاقہ مسلمانوں کے حوالے کر دیا جائے"

مولانا محمد علی نے بھی دو قومی نظریہ پر سختی سے یقین رکھتے تھے۔ اپنی ساری زندگی وہ دو قومی نظریہ ہندوستانی وفاق کی وکالت کرتے رہے جو دونوں قوموں کی باہم الہام و تقسیم کی بنیاد پر قائم کیا جائے تاہم بعض اوقات وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ تقسیم ہند ہی ایک واحد حل ہے۔ 1924 میں علی گڑھ میں اپنی تقریر میں انہوں نے کہا "اگر ہندو مسلم مسئلہ حل نہیں ہوتا تو ہندوستان کو ہندو ہندوستان اور مسلمان ہندوستان میں تقسیم کرنا پڑے گا"

دسمبر 1929 میں آل انڈیا خلافت کانفرنس لاہور کی استقبالیہ کمیٹی کے صدر کی حیثیت سے اپنے خطاب میں نواب سر ذوالفقار علی خان نے کہا "ہندوستان کی آزادی اور ترقی کا انحصار اس بات پر ہے کہ شمالی ہند میں مسلمانوں کو ایک ایسا علاقہ دیا جائے جو دو یا تین صوبوں پر مشتمل ہو یا اسے ایک صوبہ قرار دیا جائے۔ اس طرح سے مشرقی ہندوستان میں بنگال کو اس طرح سے تقسیم کر دینا چاہیئے کہ مسلمانوں کی آبادی کا حصہ 80% ہو جائے۔ مسلمانوں کو محض حقوق کے بجائے ایک علیحدہ مملکت کا مطالبہ کرنا چاہیئے"

29 دسمبر 1930 کو ڈاکٹر علامہ محمد اقبال نے الہ آباد میں آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں اپنے خطبہ صدارت میں فرمایا "میں پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان کو ایک ریاست میں مدغم دیکھنا چاہتا ہوں۔ خود مختار حکومت خواہ سلطنت برطانیہ کے اندر ہو یا سلطنت برطانیہ کے باہر، مجھے ایک متحدہ شمال مغربی ہندوستانی مسلم ریاست مسلمانوں کا کم سے کم شمال مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کا آخری مقدر معلوم ہوتا ہے"

جنوری 1933 میں کیمبرج کے ایک طالب علم چوہدری رحمت علی نے "اب یا کبھی نہیں" کے عنوان سے ایک کتابچہ شائع کیا اور پاکستان (پاک لوگوں کی سرزمین) کی اصطلاح متعارف کرائی۔ یہ اصطلاح پنجاب، افغان صوبے (شمال مغربی سرحدی صوبہ) کشمیر اور سندھ کے پہلے حرف اور بلوچستان کے لفظ کے آخری حصے کو ملا کر بنائی گئی تھی۔ اس کتابچہ میں مصنف نے لکھا کہ متذکرہ بالا شمالی ہندوستان کے ان پانچ صوبوں میں چالیس ملین کی کل آبادی میں مسلمان 30 ملین ہیں جن کا مذہب، ثقافت، تاریخ، معاشرتی طرز زندگی اور معاشی نظام بنیادی طور پر بقیہ ہندوستان میں رہنے والے لوگوں سے بالکل مختلف ہے۔ ان مسلمان بھائیوں کے نام پر جو پاکستان میں رہیں گے انہوں نے ان مسلم اکثریتی اکائیوں کے علیحدہ وفاق کا مطالبہ کیا۔ رحمت علی نے پمفلٹ، ہینڈبل اور دیگر لٹریچر کی طباعت اشاعت اور تقسیم کیلئے پاکستان نیشنل موومنٹ بھی قائم کی تھی اور پاکستان نام سے ایک ہفتہ وار اخبار بھی جاری کیا۔ چنانچہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ 1937 میں آل انڈیا مسلم لیگ نے قائداعظم کی زیر قیادت مسلم لیگ کی تنظیم نو کا فریضہ انجام دیا اور دو قومی نظریہ کی بنیاد پر تقسیم ہند کا فلسفہ رفتہ رفتہ کئی سیاست دانوں، مصنفین اور دانشوروں کی فکر و عمل کا حصہ بنتا گیا تاہم

اس نظریہ کو باقاعدہ مطالبے کی شکل میں پیش کرنے میں لیگ کو مزید تین سال لگے۔ اکتوبر 1938 میں قائداعظم کی زیر صدارت سندھ صوبائی مسلم لیگ کانفرنس کراچی میں ہوئی۔ اپنے صدارتی خطبے میں مسٹر جناح نے کانگریس پر مسلم لیگ کو تباہ کرنے کی کوششوں کا الزام لگایا کیونکہ وہ مسلمانوں کو تقسیم کرنے اور ان پر غلبہ حاصل کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ انہوں نے خبردار کیا کہ اس کا نتیجہ محض ہندوستان کی تقسیم کی صورت میں نکلے گا۔ کانفرنس کی استقبالیہ کمیٹی کے چیئرمین جناب عبداللہ ہارون نے مسلمان ریاستوں کے ایک خودمختار وفاق کے ممکنہ قیام کی جانب اشارہ کیا۔ شیخ عبدالمجید نے خبردار کیا کہ کوئی دوسرا متبادل نہیں رہ جائے گا اور کوئی چیز کراچی سے گلگت تک کے مسلمانوں کو ان کے حق خودارادیت کی طرف پیش رفت کرنے سے نہیں روک سکے گی۔

قائداعظم اور نظریہ پاکستان

مسلمانوں کے لئے علیحدہ مملکت کے مطالبے کی بنیاد دو قومی نظریہ تھا جو اقبال نے باقاعدہ شکل میں پیش کیا اور قائداعظم نے اسے سیاسی اور قانونی اصلاحات کی شکل میں واضح کیا۔ قائداعظم نے اس نظریہ کو کانگریس کے اس نظریہ کے جواب میں پیش کیا جس کے مطابق ہندوؤں کا یہ بیان تھا کہ سارا ہندوستان مذہب، نسل زبان اور ذات پات کی تفریق سے بالاتر ہو کر ایک واحد سیاسی قومیت ہے۔ قائداعظم کی توجہ ہندوستانی مسلمانوں کی اصل منزل کی طرف مرکوز تھی ان کی والہانہ باصلاحیت قیادت کے زیر سایہ مسلمانان ہند نے ایک خود مختار ریاست کی منزل کی طرف پیش قدمی کی اور پاکستان کی جدوجہد کو کامیابی سے ہمکنار کیا۔ مارچ 1940 میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں تقریر کرتے ہوئے قائداعظم نے اپنے نظریات یوں بیان فرمائے "مجھے بتایا گیا ہے کہ میں اسلام کو نقصان پہنچانے کا مرتکب ہوا ہوں کیونکہ اسلام جمہوریت کی تلقین کرتا ہے۔ مگر جہاں تک مجھے اسلام کا علم ہے وہ ایسی جمہوریت کی وکالت نہیں کرتا جو غیر مسلم اکثریت کو مسلمانوں کی قسمت کا فیصلہ کرنے کا اختیار دے۔ ہم کوئی ایسا نظام حکومت قبول نہیں کر سکتے جس کی رو سے ایک غیر مسلم اکثریت تعداد کی بنا پر ہم مسلمانوں پر حکومت کرے اور ہمیں اپنا فرمانبردار بنائے"

24 مارچ 1940 کو اپنے لاہور کے سالانہ اجلاس میں آل انڈیا مسلم لیگ نے اپنی مشہور قرارداد منظور کی جو قرارداد پاکستان کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس میں ہندوستان کے شمال مغربی اور مشرقی علاقوں کو جو مسلم اکثریتی تھے انہیں خودمختار ریاستیں بنانے کا مطالبہ کیا گیا۔ قائداعظم محمد علی جناح نے 22 مارچ 1940 کے افتتاحی اجلاس میں مسلمانوں کا مطالبہ پاکستان پیش کیا اور اپنے صدارتی خطاب میں فرمایا۔

"یہ مسئلہ جو ہندوستان میں ہے فرقوں اور فرقوں کے درمیان نہیں، بلکہ بین الاقوامی ہے اور اس کو بین الاقوامی ہی مان کر حل کرنا چاہئے اگر حکومت برطانیہ برصغیر کے باشندوں کیلئے یہ چاہتی ہے کہ ان کو امن اور خوشی حاصل ہو اور اس کی یہ خواہش واقعی مخلصانہ ہے تو اس کی صرف یہ ایک صورت ہے کہ ہندوستان کو تقسیم کر کے بڑی اقوام کیلئے جداگانہ قومی وطن منظور کئے جائیں۔ جیسا کہ عام طور پر مشہور ہے اور سمجھا جاتا ہے کہ مسلمان اقلیت نہیں ہیں۔ ذرا کوئی آنکھیں کھول کر دیکھے تو اس کو معلوم ہوگا کہ اسی نقشے کی رو سے جو برطانویوں نے بنایا ہے ہندوستان کے گیارہ صوبوں میں سے چار میں مسلمانوں کو کم و بیش غلبہ حاصل ہے اور وہ اس کے باوجود حکومتیں چلا رہے ہیں کہ کانگریس کی اعلیٰ ہندو قیادت عدم تعاون اور سول نافرمانی کیلئے تیاریاں کر رہی ہے۔ قوم کی ہر تعریف کے مطابق مسلمان ایک قوم ہیں اور چاہئے کہ ان کے پاس قومی وطن ہو ان کا اپنا ملک ہو اور اپنی ریاست ہو۔ ہماری یہ خواہش ہے کہ آزاد اور خود مختار قوم کی حیثیت سے اپنے ہمسایوں کے ساتھ امن و اتحاد سے رہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہماری قوم، اپنے تصورات اور مزاج کے مطابق اور جس طرح ہمارے خیال میں بہتر ہو روحانی، ثقافتی، اقتصادی اور سیاسی زندگی میں ترقی کرے"

اس کے بعد جناح کی زندگی کا مقصد صرف یہ بن گیا کہ وہ لوگوں، برطانوی حکومت اور انڈین کانگریس کے قائدین کے سامنے دو قومی نظریہ اور تشریح کریں۔ دو قومی نظریہ کو ذہن میں رکھتے ہوئے احمد آباد میں 28 دسمبر 1940 کو قائداعظم نے اعلان کیا "ہندوستان کو تقسیم کر دینا چاہئے تاکہ ہندو اور مسلمان دوستوں اور اچھے ہمسایوں کی طرح رہیں اور اپنے مزاج کے مطابق زندگی بسر کریں"

دوبارہ 19 مارچ 1944 کو لاہور میں پنجاب مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن سے خطاب کرتے ہوئے قائداعظم نے اشتراکیت کو مسترد کرتے ہوئے کہا "میں کمیونسٹ پارٹی کو تنبیہ کرتا ہوں کہ وہ مسلمانوں کا پیچھا چھوڑ دے اسلام ہمارا رہنما ہے اور ہماری زندگی کا مکمل ضابطہ ہے۔ ہمیں کسی ازم کی ضرورت نہیں ہے"

۱۴ جون 1945 کو قائداعظم نے پشاور میں مسلمان طلباء سے کہا کہ انہیں قوم کو منظم کرنے میں مدد دینا چاہئے تاکہ یہ آزادی حاصل کر سکے اور اسلامی نظریات اور اصولوں کے مطابق زندگی گزار سکے انہوں نے کہا" پاکستان سے مطلب یہی نہیں کہ ہم غیر ملکی حکومت سے آزادی چاہتے ہیں۔ اس سے حقیقی مراد مسلم نظریہ ہے جس کا تحفظ نہایت ضروری ہے۔ ہم نے صرف اپنی آزادی حاصل ہی نہیں کرنی، ہم نے اس قابل بھی بننا ہے کہ ہم اس کی حفاظت کر سکیں اور اسلامی تصورات اور اصولوں کے مطابق زندگی گزار سکیں۔"

قائداعظم کے مطابق اسلامی مملکت پاکستان ایک مثالی سیکولر ریاست کی خصوصیات کی حامل ہوگی جو ہر شہری کو مذہبی آزادی کی ضمانت فراہم کرے گی اور مذہب یا نسل کے کسی امتیاز کے بغیر تمام شہریوں کی فلاح و بہبود کیلئے کام کرے گی۔ 11 اگست 1947 کو آئین ساز اسمبلی سے صدارتی خطاب کے دوران قائداعظم نے فرمایا" اب آپ آزاد ہیں اپنے مندروں، مسجدوں اور دوسری عبادت گاہوں میں جا کر اپنے عقیدے کے مطابق عبادت کریں۔ آپ کسی مذہب، ذات یا فرقے سے تعلق رکھتے ہوں اس کا ریاست کے کاروبار سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ہم اس بنیادی اصول کے تحت کام شروع کر رہے ہیں کہ ہم سب شہری ہیں اور ایک واحد ریاست کے مساوی شہری ہیں میرا خیال ہے کہ ہم سب کو یہی نصب العین اپنے سامنے رکھنا چاہئے اور آپ دیکھیں گے جوں جوں وقت گزرتا جائیگا ہندو ہندو نہیں رہیں گے اور مسلمان مسلمان نہیں رہیں گے۔ مذہبی مفہوم میں نہیں کیونکہ وہ تو ہر فرد کا ذاتی عقیدہ ہے بلکہ سیاسی اعتبار سے اور ایک ریاست کے شہریوں کی حیثیت سے"

علامہ اقبال اور نظریہ پاکستان:

بیسویں صدی کے نصف اوائل میں برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں میں نشاۃ الثانیہ کا تصور پیدا کرنے اور اسے فروغ دینے میں علامہ ڈاکٹر محمد اقبال کا نام سب سے نمایاں ہے۔ اپنی شاعرانہ بصیرت اور سیاسی سوجھ بوجھ جو ان کی تحریر و تقریر اور سیاسی کاموں میں دکھائی دیتی ہے اسے دیکھتے ہوئے بجا طور پر علامہ اقبال کو ہندوستان کے مسلمانوں کیلئے ایک عظیم قائد سمجھا جا سکتا ہے۔ انہوں نے ایک ایسا سیاسی نظریہ پیش کیا جو مسلمانان برصغیر کیلئے ایک علیحدہ وطن کا مطالبہ کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ بعد میں اسلامی جمہوریہ پاکستان کی شکل میں عالم وجود میں آیا۔

1930 میں الہ آباد میں مسلم لیگ کے سالانہ جلسے میں اپنے صدارتی خطاب کے دوران انہوں نے دو مشہور جملے کہے جنہوں نے انہیں مصور پاکستان کا خطاب عطا کیا" میں پنجاب، صوبہ سرحد سندھ اور بلوچستان کو ایک واحد ریاست میں مدغم دیکھنا چاہتا ہوں۔ خود مختار حکومت خواہ سلطنت برطانیہ کے اندر ہو یا سلطنت برطانیہ کے باہر، مجھے ایک متحدہ شمالی مغربی ہندوستانی ریاست مسلمانوں کا کم سے کم شمال مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کا آخری مقدر معلوم ہوتا ہے"

اسی تقریر میں انہوں نے آگے چل کر فرمایا کہ یورپی جمہوریت کے اصول ہندوستان پر نہیں کیا جا سکتا یہاں فرقہ واریت اتنی شدید ہے کہ ہندوستان جیسے ملک کو ایک یکساں متحد قسم کی شکل نہیں دی جا سکتی۔ ہندوستان میں صرف مسلمان ہی وہ واحد طبقہ ہیں جنہیں جدید تصور کے مطابق ایک قوم کہا جا سکتا ہے۔ اسلام میں قوم کے تصور پر روشنی ڈالتے ہوئے اقبال نے تجویز پیش کی کہ ہمیں مغربی طرز کی قومیت اور اسلامی نظریہ میں امتیاز کرنا ہوگا کیونکہ اول الذکر کی بنیاد فرد کی اپنے ملک سے وفاداری پر ہے جب کہ مؤخر الذکر میں مذہب ہی وہ واحد طاقت ہے جو تمام مسلمانوں کو یکجہتی کی ڈور میں باندھ رکھتا ہے۔

اپنی ملت پر قیاس اقوام مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمیؐ
ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار
قوت مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری

چنانچہ اقبال کیلئے پوری امت مسلمہ ایک قوم ہے کیونکہ اس کی بنیاد توحید پر قائم ہے۔ چنانچہ یہ نسل رنگ زبان اور علاقے کے تمام بندھنوں کی تکذیب کرتی ہے۔ دراصل اس کا بنیادی مقصد تمام انسانیت کو ایک متحدہ شکل دینا ہے جیسا کہ اقبال نے کہا۔

یہی مقصود فطرت ہے، یہی رمز مسلمانی
اخوت کی جہانگیری، محبت کی فراوانی
بتانِ رنگ و خوں کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا
نہ تورانی رہے باقی، نہ ایرانی، نہ افغانی

اقبال کے پاس اسلام ایک آفاقی مذہب ہے جس میں دنیا کی مختلف نسلوں سے تعلق رکھنے والے افراد کو بھائی چارہ میں باندھ لینے کی صلاحیت ہے۔ چنانچہ وسیع تناظر میں اقبال ایک ایسی بین الاقوامی اسلامی ریاست کا خواب دیکھتے تھے جو تمام مسلمانوں پر مشتمل ہو اور جس میں نسلی یا علاقائی بنیادوں پر کوئی امتیاز نہ ہو۔ اقبال امت مسلمہ کے بارے میں بحث کرتے ہوئے نسلی امتیاز کو مسترد کرتے ہیں۔

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کیلئے
نیل کے ساحل سے لیکر تابخاک کاشغر

اسلامی یکجہتی کی راہ میں کیا امر حائل ہے؟ مسلمانوں میں نسل پرستی کا رجحان اسلامی یکجہتی کا سب سے بڑا دشمن ہے چنانچہ مسلمان اگر نسل پرستی پر اصرار کرتے رہے تو وہ مٹ جائیں گے اقبال فرماتے ہیں۔

جو کریگا امتیاز رنگ و خوں مٹ جائے گا
ترک خرگاہی ہو یا اعرابی والا گہر
نسل اگر مسلم کی مذہب پر مقدم ہو گئی
اڑ گیا دنیا سے تو مانند خاک رہگزر

دسمبر 1931 میں لندن میں منعقدہ دوسری گول میز کانفرنس میں شرکت کے بعد علامہ اقبال 1932 میں ہندوستان واپس تشریف لائے اور آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر منتخب ہو گئے۔ لیگ کے مارچ 1932 کے اجلاس میں انہوں نے دوبارہ اپنی مجوزہ اسلامی ریاست کا خاکہ پیش کیا انہوں نے کہا۔ دراصل پوری امت کی اصلاح کی ضرورت ہے تا کہ ہم اپنی امیدیں پوری کر سکیں اور مقاصد حاصل کر سکیں۔ سب سے پہلے ہمیں اپنے طریقہ کار میں تبدیلی لانی ہو گی۔ خدا بھی ان کی مدد نہیں کرتا جو اپنی مدد آپ نہیں کرتے۔ دانشمندانہ آزادی کے بغیر کامیابی ممکن نہیں ہوتی۔ ہمیں اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگیوں پر اسلام کو لاگو کرنا چاہیے تا کہ ایک مضبوط مملکت کا حصول ممکن ہو سکے۔ اس مقصد کے حصول کیلئے مسلم امت کے تمام وسائل کو استعمال کیا جانا چاہیے پھر پوری قوت ارادی کے ساتھ ایک مستقل پروگرام پر عمل درآمد ہونا ضروری ہے۔

اعتقادِ توحید سے ایک طرف تو باطن میں ہم آہنگی اور توازن پیدا ہوتا ہے تو دوسری طرف پوری امت مسلمہ کیلئے یکجہتی کا اصول مہیا ہو جاتا ہے۔ چنانچہ مسلمان ملت کے ڈھانچے میں رہتے ہوئے اسلام کے نظریاتی بندھنوں میں بندھے ہوتے ہیں۔ افراد اور طبقات اس بندھن کے بغیر بے مقصد ہوتے ہیں جیسا کہ اقبال نے کہا۔

فرد ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں، اور بیرون دریا کچھ نہیں

علامہ اقبال نے 1930 سے لیکر 1937 کے دوران قائداعظم کو جو خطوط لکھے اس میں اس نقطہ نظر کی مزید وضاحت کی ہے جس میں انہوں نے نظریہ پاکستان سے متعلق اپنے خیالات کھل کر بیان کئے ہیں۔ مارچ 1937 میں انہوں نے قائداعظم کو لکھا "ہمیں اس حقیقت کو نظرانداز نہیں کرنا چاہیے کہ ایشیا میں اسلام کی اخلاقی اور سیاسی قوت کے مستقبل کا انحصار بہت بڑی حد تک خود ہندوستانی مسلمانوں کی مکمل قومی تنظیم پر ہے"

جون 1937 میں قائداعظم کے نام ایک اور خط میں انہوں نے لکھا "اس وقت مسلم قوم کو اس طوفان بلا میں جو شمال مغربی ہند اور شاید ملک کے گوشے گوشے سے اٹھنے والا ہے، صرف آپ ہی کی ذات گرامی سے رہنمائی کی توقع ہے۔ ہندوستان کے مسلمان امید کرتے ہیں کہ اس مشکل موقع پر آپ کی شخصیت ہی ان کو موجودہ مشکل حالات میں سے نکال سکتی ہے۔ ہندوستان میں قیام امن اور مسلمانوں کو غیر مسلموں کے غلبہ اور تسلط سے بچانے کی واحد ترکیب مسلم صوبوں پر مشتمل ایک جداگانہ وفاق کا قیام ہے۔"

تحریک علی گڑھ اور اسکے تعلیمی و سیاسی اثرات

سرسید احمد خان مسلمانوں کے سیاسی، مذہبی ادبی اور سماجی رہنما تھے۔ وہ ہماری قومی اور ادبی تاریخ کی نامور شخصیت تھے۔ انہیں انیسویں صدی کا عظیم مصلح اور مسیحا سمجھا جاتا ہے۔ انہوں نے ہندوستان کے مسلمانوں کی ڈوبتی ہوئے کشتی کو منجدھار سے نکال کر ساحلِ مراد تک پہنچانے کا پروگرام بنایا اور مسلمانوں کو خواب غفلت سے جگانے کے لئے جدید علوم کی طرف راغب کیا۔ اس مقصد کو عملی جامہ پہنانے کے لئے سرسید نے علی گڑھ میں ایک ایسے تعلیمی ادارے کی بنیاد رکھی جو ان کی زندگی ہی میں جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کی اصلاح اور ترقی کی سب سے بڑی تحریک بن گیا۔

تحریک علی گڑھ کا نقطۂ نظر: 1857ء کی جنگِ آزادی کے بعد سرسید کی عاقبت اندیش نگاہوں نے مستقبل کو دیکھ لیا تھا کہ مسلمانوں کی ترقی کا دارومدار انگریزوں کی بغاوت میں نہیں بلکہ ان کے علوم سیکھنے میں ہے اس لئے انہوں نے مسلمانوں کو پستی سے نکالنے کیلئے شب و روز انتھک محنت کی اور مسلمانوں کو جدید تعلیم سے آراستہ کرنے کیلئے تعلیمی منصوبہ بنایا۔ انکا یہی منصوبہ تاریخ میں تحریک علی گڑھ کے نام سے مشہور ہوا اور یہی وہ نقطۂ نظر ہے جو تحریک علی گڑھ کا باعث بنا۔

تحریک علی گڑھ اور عملی اقدامات (تعلیمی پہلو): سرسید احمد خان نے مسلمانوں کو جدید تعلیم سے آراستہ کرنے کا پختہ ارادہ کر لیا اور اس ارادے کا اظہار کرنے سے پہلے انہوں نے انگریزوں کے دلوں سے یہ احساس دور کیا کہ مسلمان غدار نہیں بلکہ وہ وفادار ہیں اس سلسلے میں سرسید احمد خان نے "اسبابِ بغاوتِ ہند" اور "ہندوستان میں وفادار مسلمان" کتابیں لکھ کر انگریزوں کی تمام غلط فہمیاں دور کر دیں۔ اس کے بعد انہوں نے مسلمانانِ ہند کے سامنے اپنے نظریات پیش کرنے کے لئے ایک رسالہ "تہذیب الاخلاق" جاری کیا اس رسالے نے مسلمانوں کو جدید تعلیم کی طرف راغب کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ جب مسلمان ذہنی طور پر جدید تعلیم کے لئے تیار ہو گئے تو سرسید نے اپنا تعلیمی منصوبہ تیار کیا اور مختلف علاقوں میں مدرسے اور اسکول قائم کرنا شروع کر دیئے۔ تعلیمی منصوبے کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کیلئے مندرجہ ذیل عملی اقدامات کئے گئے۔

۱۔ مراد آباد میں مدرسہ کا قیام: سرسید احمد خان نے 1859ء میں مراد آباد میں ایک مرسہ قائم کیا۔ اس سے پہلے مراد آباد میں کوئی مدرسہ نہ تھا۔ اصل میں اس مدرسہ کا قیام ایک تجربہ تھا جس سے سرسید کو اندازہ ہو گیا کہ مسلمان تعلیمی میدان میں ان کا ساتھ ضرور دینگے۔

۲۔ سائنٹفک سوسائٹی کا قیام: 1862ء میں سرسید احمد خان نے غازی پور میں ایک سائنٹفک سوسائٹی قائم کی اس سوسائٹی نے جدید علوم کی اشاعت میں اہم کردار ادا کیا اس سوسائٹی نے تاریخ، کیمیا، طبیعات، بیالوجی اور ریاضی کی انگریزی کتابوں کے اردو ترجمے کرائے اور ان ترجموں کو چھاپنے کے لئے چھاپہ خانہ کا اہتمام کیا۔ اس سوسائٹی کا سب سے بڑا کارنامہ مسلمانوں کی ذہنی اور فکری آبیاری کرنا تھا۔

۳۔ غازی پور میں وکٹوریہ اسکول کا قیام: 1864ء میں سرسید احمد خان نے عوام کے چندے سے غازی پور میں ایک اسکول قائم کیا جس کا نام وکٹوریہ اسکول تھا اس اسکول میں انگریزی کو ذریعہ تعلیم بنایا گیا۔ جس سے مفید نتائج برآمد ہوئے۔ اس اسکول کے قیام سے سرسید احمد خان نے مسلمان نوجوانوں کی صلاحیتوں کا اندازہ لگا لیا کہ وہ انگریزی زبان سیکھنے میں کسی طرح بھی دوسری اقوام کے بچوں سے پیچھے نہیں ہیں۔ نیز مسلمان اپنے بچوں کو جدید تعلیم سے آراستہ کرنے کے لئے ہر قسم کی قربانی دینے کو تیار ہیں۔

۴۔ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کا اجراء: 1866ء میں سرسید احمد خان نے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ جاری کیا اس رسالے کا سب سے بڑا مقصد انگریزوں کو ہندوستان میں رہنے والوں کے مسائل سے روشناس کرانا تھا۔ اس اخبار میں انگریزوں کی زیادتیوں اور معاشرتی استحصال پر نکتہ چینی کی جاتی تھی۔ اس رسالے میں معاشرتی، اخلاقی، اور سائنسی مضامین بڑی پابندی سے شائع کئے جاتے

محرک منشی چراغ دین تھے اس انجمن کا مقصد بچوں کی تعلیم و تربیت تھا۔ اس انجمن نے جدید علوم اور مذہبی تعلیم کے لئے بہت سے ادارے قائم کئے۔ یہ انجمن آج بھی تعلیمی مشاغل میں مصروف ہے۔

تحریک علی گڑھ سے متاثر ہو کر صوبہ سرحد کے آزاد منش مسلمانوں نے اپنے علاقے میں تعلیم کو عام کرنے کے لئے ایک تعلیمی تحریک چلائی اس تحریک کے بانی صاحبزادہ عبدالقیوم تھے اس تحریک نے پشاور میں اسلامیہ ہائی اسکول اور اسلامیہ کالج قائم کئے ان دونوں اداروں نے سرحد میں جدید تعلیم کو عام کیا اور ایسے طلباء پیدا کئے جنہوں نے تحریکِ پاکستان میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

تحریک علی گڑھ نے سندھ کے مسلمانوں کو بہت متاثر کیا سیا امیر علی جو لندن میں مسلمانانِ ہند کے لئے کام کر رہے تھے 1883ء میں کراچی آئے اور حسن علی آفندی پر زور دیا کہ وہ سندھ کے مسلمانوں کیلئے ایک معیاری درسگاہ قائم کریں چنانچہ 1885ء میں حسن علی آفندی نے کراچی میں سندھ مدرسہ قائم کیا جس میں جدید تعلیم کے ساتھ ساتھ مذہبی تعلیم کا معیاری انتظام کیا گیا اس مدرسے نے ایسے قابل راہنما پیدا کئے جنہوں نے تحریک پاکستان میں نمایاں کردار ادا کیا۔

ہندوستان میں تحریک علی گڑھ نے کئی اداروں کو جنم دیا جن میں جامعہ ملیہ، دارالعلوم دیوبند اور ندوۃ العلماء لکھنو قابلِ ذکر ہیں۔ یہ ادارے اگرچہ سرسید احمد خان اور تحریک کی مخالفت میں تھے مگر پھر بھی سرسید کی تحریک سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

1898ء میں سرسید احمد خان کے انتقال کے بعد ان کے ساتھیوں نے اس تحریک کو جاری رکھا اور سرسید احمد خان کے مشن کو پورا کیا۔

انڈین نیشنل کانگریس کا قیام 1885ء

جنگِ آزادی 1857 کے بعد ہندوستانی عوام میں باغیانہ بے چینی پھیلنے لگی اور وہ انگریزوں سے نفرت کرنے لگے۔ انگریزوں نے جنگِ آزادی کے بعد بعض ایسے اقدامات بھی کئے جن سے عوام کا خون کھولنے لگا۔ 1876ء سے 1880ء کے دور میں انگریزوں نے بلا جواز افغانستان کے خلاف جنگ چھیڑ دی۔ اس سے ہندوستانیوں بالخصوص مسلمانوں کے جذبات خواہ مخواہ مشتعل ہوئے۔ اسی دوران انگریزوں نے اسلحہ ایکٹ منظور کر کے عام ہندوستانیوں کو اسلحہ رکھنے کے لئے لائسنس کا پابند کر دیا نیز اسلحہ بنانے اور اس کی تجارت کرنے کی بھی ممانعت کر دی جبکہ سرکاری ملازمین اور انگریزوں پر یہ پابندی نہیں تھی۔ یہ امتیاز گویا ہندوستانیوں کو ناقابلِ اعتبار سمجھنے کا اعلان تھا۔ 1878ء میں جنوبی ہند کے وسیع علاقے پر قحط پڑ گیا جس سے پچاس لاکھ لوگ جان کی بازی ہار گئے۔ قحط دور کرنے کے لئے لارڈ لٹن نے کوئی خاطر خواہ بندوبست نہ کیا بلکہ وہ دہلی میں عیاشی کرتا رہا۔ عوام نے اس قحط سے میں ہلاک شدگان کا ذمہ دار ٹھہرایا۔ بعد ازیں لارڈ لٹن نے اسی سال ورنیکلر پریس ایکٹ جاری کر دیا جس کی رو سے غیر سرکاری اخبارات کو یہ ضمانت دینا پڑی کہ وہ حکومت کے خلاف مضامین لکھ کر عوام کو اس سے بدظن نہیں کریں گے۔

کانگریس کا قیام اور انگریزی مقاصد: انگریزوں کو اس بات کا احساس ضرور ہو گیا کہ ہندوستان کے عوام سیاسی طور پر بیدار ہو چکے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے زیرِ زمین سرگرمیوں اور سازشوں سے بچنے کی آسان صورت یہ تجویز کی کہ عوام کو نقاد اظہارِ خیال کا موقع فراہم کر دیا جائے۔ چنانچہ مسٹر ہیوم جو ایک برطانوی سول سروس کا اعلیٰ عہدیدار تھا نے یہ اندازہ پوری طرح لگا لای کہ ہندوستان میں سیاسی اضطراب پھیل چکا ہے اور جگہ جگہ خفیہ سازشیں ہو رہی ہیں ان سازشوں اور اضطراب کو روکنے کے لئے ہیوم نے ایک سیاسی قومی سطح کی تعلیم کا منصوبہ پیش کیا۔ چنانچہ لارڈ ڈفرن نے اپنی منظور اور کچھ تجاویز کے ساتھ مسٹر ہیوم کو برطانیہ روانہ کیا تا کہ وہ اکابرین سلطنت سے صلاح مشورہ کر لے۔ لہذا برطانیہ میں اس نے لارڈ رپن، لارڈ ڈلہوزی، سر جیمز اور مسٹر سلیگ سے مل کر صلاح مشورہ کیا جس میں نمایاں کامیابی ہوئی۔ چنانچہ جب وہ 28 دسمبر 1985ء کو واپس ہندوستان آیا تو اس کے پاس ایک نئی سیاسی جماعت کی تشکیل کا اچھا خاصہ ڈھانچہ موجود تھا۔ لہذا 28 دسمبر 1985ء کو اس نے ایک بنگالی عیسائی مسٹر بینرجی کی صدارت میں بمبئی میں ایک اجلاس منعقد کیا جس میں انڈین نیشنل کانگریس کی تشکیل کا باقاعدہ اعلان کر دیا گیا۔ اس اجلاس میں ہندوستان کے مختلف علاقوں کے مندوبین کی تعداد جو 27 تھی۔ جن میں صرف دو مسلمان تھے۔

انڈین نیشنل کانگریس کے اغراض و مقاصد: مسٹر بینرجی نے کانگریس کے اجلاس میں اپنے خطبہ صدارت میں انگریزوں کو یقین دلایا کہ وہ اور کانگریس ہمیشہ ان کی وفادار رہیں گے اور پھر اس نے کانگریس کی طرف سے جن اغراض و مقاصد کا اعلان کیا وہ حسب ذیل تھے۔

۱۔ ہندوستانی نمائندوں کو حکومت میں نمائندگی دی جائے گی۔
۲۔ قومی وحدت کے لئے بھرپور سعی کی جائے گی۔
۳۔ انگریزوں سے وفاداری کی جائے گی۔
۴۔ انفرادی حکومت کا تحفظ کیا جائے گا۔
۵۔ سرکاری ملازمتوں میں ہندوستانی باشندوں کو شریک کیا جائے گا۔
۶۔ مجلس قانون ساز بنائی جائے گی جس میں ہندوستانی نمائندوں کو شرکت کی اجازت ہوگی۔
۷۔ ملک میں ایک دستوری (آئینی) حکومت بنائے گی۔
۸۔ انگریزوں نے نہ صرف کانگریس کو جنم دیا بلکہ یہ دیکھتے ہوئے بھی کہ کانگریس اپنے اصل اغراض و مقاصد سے ہٹ کر انقلابی ہندوؤں کے ہاتھوں میں انقلابی رنگ اختیار کر رہی ہے۔ پھر بھی مدتوں وہ اس کی پرورش اور قیادت کرتے رہے۔ کانگریس کی بھی یہی صورت حال تھی۔ وہ اس قدر انگریز نواز تھی کہ برسوں "گلیڈسٹون" کی سالگرہ مناتی رہی۔ کانگریس کے دوسرے اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے دادا بھائی نوروجی نے کہا "ہم اپنی ریڑھ کی ہڈی تک انگریز کے وفادار ہیں" بس اس طرح کانگریس ہندوؤں اور انگریزوں کے سیاسی مقاصد پورے کرتی رہے۔

تقسیم بنگال کے اسباب و نتائج

تقسیم بنگال: تقسیم بنگال بیسویں صدی کا نہایت اہم واقعہ ہے۔ اس صوبے کی آبادی بھی بہت زیادہ تھی۔ آبادی کے زیادہ ہونے کے علاوہ رقبہ بھی بہت تھا۔ اس کا نظام چلانا بہت مشکل ہو گیا تھا۔ اس لئے انتظامی سہولت کے پیش نظر انگریزوں نے بنگال کو 1905 میں دو حصوں میں تقسیم کر دیا اور دونوں حصوں کو دو صوبوں کا نام دیدیا گیا۔ ایک صوبہ مغربی بنگال اور دوسرا صوبہ مشرقی بنگال کے نام سے مشہور ہوا۔ تقسیم ہند کے وقت مشرقی بنگال پاکستان اور مغربی بنگال بھارت میں شامل کر دیا گیا۔ کیونکہ مشرقی بنگال میں مسلمانوں کی آبادی بہت زیادہ تھی اور مغربی بنگال میں ہندوؤں کی اکثریت تھی۔ مشرقی بنگال کا صدر مقام ڈھاکہ اور مغربی بنگال کا صدر مقام کلکتہ کو بنایا گیا۔

تقسیم کے اسباب:

۱۔ بنگال کی آبادی اور رقبہ بہت زیادہ تھا۔ جس کی وجہ سے اس کا انتظام چلانا مشکل ہو گیا تھا۔
۲۔ ذرائع آمد و رفت کا فقدان تھا۔ اس لئے بنگال میں ہنگامی حالات پر قابو پانا مشکل ہو گیا تھا۔
۳۔ بنگال میں ہندو مسلم فسادات انگریزوں کے لئے سوہان روح بن گئے تھے۔
۴۔ تمام تجارتی اور معاشی امور پر ہندوؤں کا قبضہ تھا، کارخانہ، تجارتی منڈیاں اور کاروباری کی ساری آسانیاں ہندوؤں کو میسر تھیں۔ اس لئے مسلمانوں کی معاشی اور معاشرتی حالت بہت ہی خراب تھی۔
۵۔ بنگال میں معاشرتی برائیوں نے زور پکڑ لیا تھا۔ ڈاکہ زنی، چوری اور قتل جیسی برائیاں عام ہو چکی تھیں۔ امن و امن ختم ہو چکا تھا۔ گویا سامانی تحفظ نہ ہونے کے برابر تھا۔ اس لئے تقسیم بنگال ضروری ہو گئی تھی۔
۶۔ مشرقی حصے کی تمام پیداوار پر مغربی حصے کے لوگوں کی اجارہ داری تھی۔
۷۔ ہندو زمینداروں نے مسلمانوں پر ظلم و تشدد کیا ہوا تھا اور انہوں نے مسلمانوں کا معیار زندگی پست کر دیا تھا

تقسیم بنگال: تقسیم بنگال مسلمانوں کے مفاد میں تھی اس لئے ہندو اس تقسیم سے بہت ناراض ہوئے۔ انہوں نے تقسیم بنگال کے خلاف مظاہرے شروع کر دیئے۔ اس سلسلے میں ہندوؤں نے باقاعدہ تحریک چلائی اس تحریک کی کامیابی کے لئے ہندوؤں نے طرح طرح کے ہتھکنڈے استعمال کئے۔ بنگال کے انتظامی امور چلانے والوں کو تنگ کیا گیا۔ لارڈ کرزن پر طرح طرح کے الزامات لگائے گئے۔ غیر ملکی مال کا بائیکاٹ کیا گیا۔ انگریزوں پر بم پھینکے گئے۔ اس دن ہندوؤں نے سوگ کا دن منایا۔ اور بھرت رکھا اور بندے ماترم کو بطور قومی ترانہ اختیار کیا۔ ان باتوں سے تنگ آ کر لارڈ کرزن نے استعفیٰ دے دیا۔ انہوں نے اعلان کر دیا کہ جب تک حکومت برطانیہ اس تقسیم کو منسوخ نہیں کرتی۔ وہ چین سے نہیں بیٹھیں گے۔ ان کا یہ سلسلہ 1911ء تک چلتا رہا۔

تقسیم بنگال پر مسلمانوں کا ردِ عمل: تقسیم بنگال پر مسلمانوں نے نہ صرف خوشی کا اظہار کیا بلکہ اطمینان کا سانس بھی لیا۔ تقسیم بنگال

مسلمانوں کے مفادات میں تھی اس لئے انہوں نے تقسیم کے فیصلے کو قبول کر لیا اور اسے برقرار رکھنے کا مطالبہ کرتے رہے۔ بلکہ اس سے معیار زندگی بلند کرنے کا راستہ ہموار ہو گیا۔ مسلمانوں نے بہت سی قراردادیں منظور کرا کر حکومت برطانیہ کو روانہ کیں اور تقسیم بنگال پر حکومت کا شکریہ ادا کیا۔

تقسیم بنگال کا نتیجہ قیام "مسلم لیگ": تقسیم بنگال نے 1905ء میں مسلمانوں میں سیاسی بیداری پیدا کر دی۔ کیونکہ تقسیم بنگال کے نتیجے میں مشرقی بنگال میں "جہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی" ہندوؤں کی بالادستی پر ضرب پڑی تھی۔ چنانچہ اس کے ردعمل پر شدید ردعمل کرتے ہوئے ہندوؤں نے اس تقسیم کی تنسیخ کے لئے تحریک شروع کر دی۔ پس یہیں سے مسلمانوں میں اپنے حقوق کے تحفظ کا احساس پیدا ہو گی۔ اس موقع پر نواب سلیم اللہ نے کہا کہ " تقسیم بنگال " نے ہمیں خواب غفلت سے بیدار کر دیا ہے اور اب ہم بہتر طور پر اپنی جدوجہد کی سمت موڑ سکتے ہیں چنانچہ "اکتوبر 1906ء" میں "35" مسلمانوں کے ایک وفد نے وائسرائے ہند لارڈ منٹو سے ملاقات کی اور مطالبہ کیا کہ مستقبل میں مسلمانوں کی نشستیں مخصوص کی جائیں۔ پس اس طرح تقسیم بنگال کے ردعمل میں ہندوؤں کے منفی رویے سے متاثر ہو کر مسلمانوں نے اپنی سیاسی جماعت بنانے کا عزم کیا اور "1906" میں مسلم لیگ معرض وجود میں آ گئی۔

شملہ وفد کی تشکیل، مطالبات اور اہمیت

شملہ وفد کی تشکیل: شملہ وفد کی تشکیل لکھنو میں سر عبدالرحیم کی صدارت میں مسلم قائدین کا ایک اجلاس منعقد ہوا۔ جس میں نواب محسن الملک کو اراکین کے چناؤ کا کلی اختیار دے دیا گیا انہوں نے اس وفد کے لئے 35 اراکین کا انتخاب کر لیا۔ یہی 35 رکنی وفد یکم اکتوبر 1906ء کو شملہ کے مقام پر سر آغا خان کی قیادت میں وائسرائے ہند لارڈ منٹو سے ملا اور اپنے مطالبات کی دستاویز پیش کی۔

شملہ وفد کے مطالبات: شملہ وفد نے لارڈ منٹو کو جو دستاویز پیش کی اس میں مندرجہ ذیل مطالبات تھے

۱۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے انتخابی حلقے الگ الگ کر کے انہیں جداگانہ انتخاب کا حق دیا جائے۔
۲۔ مسلمانوں کو سرکاری ملازمتوں اور یونیورسٹیوں کے سنڈیکیٹ میں مناسب نمائندگی دی جائے۔
۳۔ مسلمانوں کو مجلس قانون ساز میں مناسب نمائندگی دی جائے۔
۴۔ مسلمانوں کو عدلیہ میں نمائندگی دی جائے۔
۵۔ مسلم یونیورسٹی کے قیام کے لئے امداد دی جائے۔

شملہ وفد کی اہمیت: شملہ وفد کے مطالبات کے جواب میں لارڈ منٹو نے مسلمانوں کو پورا پورا یقین دلایا کہ ان کے سیاسی حقوق اور مفادات کا تحفظ کیا جائے گا اور دوسرے مطالبات پر ہمدردانہ غور کیا جائیگا۔ وائسرائے ہند کے اس وعدے کو برطانوی حکومت نے قانون مجریہ 1909 میں عملی شکل دے دی گئی اور جداگانہ انتخاب کا مطالبہ منظور کر لیا گیا۔ اس طرح برطانیہ نے پہلی بار مسلمانوں کی جداگانہ قومیت کو عملاً تسلیم کیا اور اسی اصول نے پاکستان کی بنیاد رکھی۔

آل انڈیا مسلم لیگ کا قیام 1906ء

پس منظر: یکم اکتوبر 1906ء کو مسلمانوں نے وائسرائے ہند لارڈ منٹو کے پاس اپنے مطالبات پیش کرنے کے لئے ایک وفد شملہ بھیجا۔ یہ 35 رکنی وفد سر آغا خان کی قیادت میں شملہ کے مقام پر لارڈ منٹو سے ملا اور اسے اپنے مطالبات کی دستاویز پیش کی۔ لارڈ منٹو نے مسلمانوں کی سیاسی حیثیت کو تسلیم کر لیا اس سے مسلمانوں میں جداگانہ وجود کا احساس پیدا ہو گیا مگر انہیں اس امر کا بھی خیال تھا کہ وہ بغیر کسی سیاسی جماعت کے اپنے مفادات کی حفاظ نہیں کر سکتے۔ ڈھاکہ میں منعقد ہونے والے اجلاس میں اس امر پر غور کیا گیا۔

مسلم لیگ کی تشکیل: چنانچہ کانفرنس کے بعد 30 دسمبر کو ایک اجلاس نواب وقار الملک کی صدارت میں منعقد ہوا اور پورے غور و خوض کے بعد "آل انڈیا مسلم لیگ" کے نام سے ایک سیاسی جماعت قائم کرنے کا فیصلہ ہو گیا۔ چنانچہ نواب وقار الملک کی صدارتی تقریر کے بعد نواب سلیم اللہ نے باقاعدہ ایک قرارداد پیش کی۔ جس میں مسلمانوں کی سیاسی جماعت کے قیام پر زور دیا گیا تھا۔ قرارداد منظور کر لی گئی اور مسلمانوں کی سیاسی جماعت وجود میں آ گئی۔ اس قرارداد کی تائید حکیم اجمل خان، مولانا محمد علی جوہر اور مولانا ظفر علی خان نے کی۔

مسلم لیگ کے اغراض و مقاصد: ڈھاکہ اجلاس میں مسلم لیگ کے مندرجہ ذیل تین مقاصد طے پائے۔

۱۔ مسلمانوں میں حکومتِ برطانیہ کے لئے وفاداری کے جذبات پیدا کرنا اور حکومت کی غلط فہمیوں کو دور کرنا۔

۲۔ مسلمانوں کے سیاسی حقوق کی حفاظت کرنا اور ضروریات کو حکومت کے سامنے پیش کرنا۔

۳۔ جہاں تک مسلمانوں کو نقصان نہ ہو دوسری قوموں سے اتحاد کرنا۔

مسلم لیگ کے اجلاس کی کاروائی مولانا محمد علی جوہر نے تحریر کی۔ اس کے جوائنٹ سیکریٹری نواب محسن الملک اور نواب وقار الملک بنائے گئے اور اس کا صدر دفتر مراد آباد (ضلع امروہہ) میں قائم کیا گیا۔ مسلم لیگ کا پہلا باقاعدہ اجلاس 30,29 دسمبر 1907ء کو کراچی میں منعقد ہوا جس میں لیگ کے دستور کی منظوری دی گئی۔ بعد ازیں مارچ 2008 میں اس کا ایک خصوصی اجلاس علی گڑھ میں ہوا۔ جس میں نئے عہدیداروں کے انتخاب کا عمل مکمل کیا گیا۔ اس اجلاس میں میجر حسین بلگرامی سیکریٹری اور سر آغا خان صدر منتخب ہوئے اور اس کا صدر دفتر بھی مراد آباد کے بجائے علی گڑھ میں طے پایا۔ اس سال مسلم لیگ کی ایک شاخ لندن میں بھی قائم کر دی گئی جس کی نگرانی سید امیر علی کے سپرد ہوئی۔

منٹو مورلی ریفارمز 1909ء

برصغیر کے مسلمانوں نے اپنی جداگانہ حیثیت اور جداگانہ مقام کو تسلیم کرانے کے لئے بہت سے اقدامات کئے تاکہ ہندوستان کے مسلمان ایک جھنڈے تلے جمع ہو جائیں اس سلسلے میں 1906ء میں مسلمانوں نے اپنی سیاسی جماعت "آل انڈیا مسلم لیگ" قائم کی۔ اور یہی وہ جماعت تھی جس نے مسلمانوں کے حقوق کے حصول اور تحفظ کے لئے حکومتِ برطانیہ کے سامنے اپنے مطالبات پیش کئے اور جگا گانہ نیابت کے حق کے لئے جان توڑ کوششیں کی۔ جداگانہ حیثیت کو تسلیم کرانے اور جداگانہ نیابت کا حق لینے کی کئی وجوہات تھیں۔ تہذیب و تمدن کے لحاظ سے دونوں قومیں ایک دوسرے سے بالکل مختلف تھیں دونوں کا ثقافتی ورثہ الگ تھا، دونوں کے مذہب اور ضابطہ حیات الگ تھا اور دونوں میں کسی بھی لحاظ سے اشتراک ناممکن تھا۔ انگریز ان حالات کو اچھی طرح سمجھتے تھے اس لئے وہ ان حالات کے پیشِ نظر ہندوستان میں جمہوری اقدار بحال کرنے کیلئے موقع کی تلاش میں تھے۔

قانونِ ہند 1909ء کی چند چیدہ چیدہ اصلاحات: قانونِ ہند 1909ء کا نفاذ نومبر 1909ء کو ہوا اس کے نفاذ سے مجموعی طور پر مسلمانوں کو اطمینان ہوا اسکی اہم اصلاحات یہ تھیں۔

۱۔ مرکزی مجلس قانون کی توسیع کی گئی اور مسلمانوں کو مرکزی کونسل میں پانچ نشستیں دے دی گئیں۔

۲۔ پنجاب، برما اور آسام کی مجالس قانون ساز میں 30 ارکان کا اضافہ ہوا۔

۳۔ بنگال، مدراس، یوپی، بمبئی، بہار اور اڑیسہ کی قانون ساز مجالس میں 50 ارکان کا اضافہ ہوا۔

۴۔ وائسرائے کونسل کے ارکان کی تعداد کو بڑھا کر ساٹھ کر دیا گیا۔

۵۔ جداگانہ نیابت کا اصول تسلیم کر لیا۔

۶۔ قانون ساز اسمبلی کو بضت پر مکمل بحث کرنے کا اختیار دے دیا گیا۔

۷۔ کونسلوں کے اختیارات میں اضافہ کیا گیا اور ان کے دائرہ بحث کو وسیع کر دیا گیا۔

۸۔ ڈسٹرکٹ بورڈوں، میونسپل کمیٹیوں، اور یونیورسٹیوں اور دوسرے اداروں کو اراکین کے انتخاب کی اجازت دے دی گئی۔

۹۔ مسلمانوں اور ہندوؤں کے رائے دہندگی کے سلسلے میں فہرستیں تیار کرنے کی اجازت بھی دے دی گئی۔

۱۰۔ وائسرائے کی کونسل میں ایک ہندوستانی کے تقرر کی اجازت دی دی گئی۔

۱۱۔ انڈین کونسل لندن میں دو ہندستانیوں کے تقرر کی اجازت دے دی گئی۔

قانونِ ہند 1909 کی اہمیت: یہ قانون "منٹو مورلے اصلاحات" کے نام سے مشہور ہے۔ اس قانون کی رو سے مسلمانوں کے مطالبے کو کسی حد تک مان لیا گیا تھا اور جداگانہ انتخاب کا اصول تسلیم کر لیا گیا تھا اس کے علاوہ عوام کو ملکی کاروبار اور قانون سازی میں اپنے خیالات و نظریات کے اظہار کا بہترین موقع فراہم کیا گیا اور بڑی حد تک ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں قوموں کی انگریزوں کے خلاف نفرت میں کمی آ گئی۔ ان اصلاحات سے پہلے وائسرائے کی انتظامی کونسل میں تمام تر انگریز ارکان ہوتے تھے اور کونسل کی تمام کاروائی ان کے اپنے جذبات اور خیالات کی عکاسی کرتی تھی اب اس میں ایک ہندوستانی رکن بھی شامل کر لیا گیا تاکہ وہ

ہندوستان کے مسائل کے بارے میں کونسل کو آگاہ کرتا رہے۔ اس طرح ان اصلاحات سے ہندوستان کے باشندوں کو اپنے جذبات حکومت تک پہنچانے کا پورا موقع مل گیا۔ ان اصلاحات میں مسلمانوں کو جداگانہ نیابت کا حق دے کر ان کی سیاسی حیثیت کو تسلیم کر لیا گیا جس سے کانگریس کے خواب چکنا چور ہو گئے۔ بہر حال ان اصلاحات کو حکومت خود اختیاری کی طرف ایک اہم قدم قرار دیا جا سکتا ہے۔

میثاقِ لکھنؤ

شملہ وفد کو کامیابی نصیب ہوئی اور جداگانہ انتخاب کا اصول تسلیم کر لیا گیا لیکن ہندوؤں نے اس اصول کو کبھی دل سے تسلیم نہیں کیا۔ مسلمانوں کی یہ کوشش تھی کہ کانگریس جو ہندوؤں کی نمائندہ جماعت ہے اس اصلو کو تسلیم کر لے۔ 1916ء مسلم لیگ کے رہنماؤں نے قائداعظم کے مشورے سے کانگریس اور مسلم لیگ کا ایک متحدہ اجلاس لکھنؤ میں بلایا۔ کانگریس متحدہ اجلاس کے لئے تیار ہو گئی چنانچہ لکھنؤ اجلاس ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین ایک سمجھوتہ ہو جا" لکھنو پیکٹ" کے نام سے مشہور ہو گیا اسی پیکٹ کو "میثاقِ لکھنؤ" کہتے ہیں۔ اس کے مطابق کانگریس نے جداگانہ انتخاب کا اصول تسلیم کر لیا۔ میثاقِ لکھنؤ کے اجلاس کی صدارت سریندر ناتھ بینرجی نے کی۔ مسلم لیگ کی طرف سے مسٹر محمد علی جناح اور راجہ محمود آباد نے سربراہی کے فرائض انجام دیئے۔

میثاق لکھنؤ کے اہم نکات: میثاق لکھنؤ میں کئی ایک اہم نکات طے کئے گئے ان نکات کی فہرست درج ذیل ہے۔

۱۔ مرکزی قانون ساز ادارے میں ڈیڑھ سو ارکان ہونگے ان میں ایک تہائی مسلمانوں کی تعداد ہو گی۔
۲۔ مسلمان نمائندہ کا انتخاب جداگانہ بنیاد پر ہو گا۔
۳۔ صوبائی قانون ساز اداروں کے لئے براہ راست انتخاب کا طریقہ اپنایا جائے گا۔
۴۔ مسلمانوں کے تناسب کی نئی صورت حال کا تعین کر دیا جائے گا۔
۵۔ کوئی مسودہ قانون تین چوتھائی اراکین کی تائید کے بغیر منظور نہیں کیا جائے گا۔
۶۔ ہر قانون ساز ادارہ اپنا صدر خود چنے گا اور ان اداروں کی میعاد پانچ سال ہو گی۔
۷۔ گورنر جنرل کی ویٹو پاور کو محدود کر دیا جائیگا۔
۸۔ کمیشنڈ اور نان کمیشنڈ عہدوں پر بھی ہندوستانیوں کا تقرر کیا جائے گا۔
۹۔ گورنر اپنی انتظامیہ میں نصف اراکین ہندوستانی مقرر کرے گا۔
۱۰۔ انتظامیہ اور عدلیہ الگ ہوں گی اور صوبائی عدالتیں، صوبائی کورٹ کے ماتحت ہوں گی۔

میثاق لکھنؤ کی اہمیت: یہ معاہدہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی باہمی مصالحت اور آئینی دستوری تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ حقیقت پسندانہ اور منصفانہ سمجھوتہ تھا جس سے ہندو اور مسلمان دونوں مطمئن ہو گئے تھے۔ حکومت برطانیہ کا ایک مشترکہ تجویز بڑی تفصیل سے پیش کی گئی جس کو ہندوستان کے کروڑوں عوام کی بھرپور حمایت حاصل تھی یہ شاندار کارنامہ محمد علی جناح کی شدید محنت اور دن رات کی کوشش سے پورا ہوا۔ اسی معاہدہ کی بناء پر قائدِ اعظم کو ہندو مسلم اتحاد کا پیامبر کہا جانے لگا۔

میثاقِ لکھنؤ میں نہ صرف جداگانہ انتخاب کا حق تسلیم کیا گیا بلکہ یہ بھی طے پایا کہ مرکز میں مسلمانوں کو ایک تہائی نمائندگی کا حق دیا جائے گا نیز کسی بھی قوم کی تین چوتھائی مخالفت سے کوئی قانون منظور نہیں ہو گا۔ اس معاہدے کے رو سے مسلمانوں کے قومی تشخص کو تسلیم کر لیا گیا۔ یہ معاہدہ پورے برصغیر میں ہندو مسلم اتحاد کو خوشگوار فضا قائم کرنے میں کامیاب ہوا یہ اور بات ہے کہ بعد میں یہ معاہدہ ہندوؤں کی ہٹ دھرمی کی نذر ہو گیا۔

گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1919ء

لارڈ جیمسفورڈ ہندوستان کے وائسرائے بن کر آئے تو انہوں نے مسلم لیگ اور کانگریس کی کاروائیوں کے نتیجے کے طور پر ملک کے آئینی مسائل اور آئندہ دستوری اصلاحات پر ہندوستان کے مختلف طبقوں سے تبادلہ خیالات کا سلسلہ شروع کر دیا اور اس نتیجہ پر پہنچا کہ اب ہندوستانیوں کو کچھ نہ کچھ دیئے بغیر چارہ کار نہیں۔ چنانچہ اس نے وزیر ہند "ایڈون مانٹیگو" کو نئی اصطلاحات رائج کرنے کے لئے لکھا۔ اس کے جواب میں 20 اگست 1917ء کو مانٹیگو نے اصلاحات کے لئے اور ساتھ ہی دورۂ ہند کے لئے پروگرام کا

اعلان کر دیا۔ اس اعلان میں کہا گیا تھا کہ ہندوستانیوں کو ملکی نظم و نسق کے ہر شعبے میں زیادہ سے زیادہ اشتراک کو وسیع کیا جائے گا اور تدریجاً خود مختار اداروں کو اس مقصد کے لئے ترقی دی جائے گی۔ یہاں تک کہ ہندوستان عظیم برطانیہ کے جزو لاینفک کی حیثیت سے ترقی کی راہیں طے کرے گا اور ایک ذمہ دار حکومت بن جائے گا۔

بنیادی نکات: مانٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات یعنی گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے بنیادی نکات حسب ذیل ہیں۔

۱۔ مرکزی قانون ساز مجلس (اسمبلی) کو دو ایوانوں میں تقسیم کر دیا گیا ایک مرکزی مجلس قانون ساز اور دوسری ریاستی کونسل۔ اور ان دونوں ایوانوں میں اکثریت منتخب اراکین کی رکھی گئی۔

۲۔ مرکزی مجلس قانون ساز میں 150 ارکان تھے جن میں 103 منتخب اور 47 نامزد ارکان تھے۔

۳۔ ریاستی کونسل میں 60 ارکان تھے جن میں سے 33 منتخب اور 27 نامزد ارکان تھے جنہیں نامزد کرنے کا اختیار وائسرائے کو تھا۔

۴۔ مرکزی مجلس قانون ساز کی مدت تین سال مقرر کی گئی۔

۵۔ ریاستی کونسل (Council of State) کی میعاد پانچ سال مقرر کی گئی لیکن وائسرائے کو اس میعاد میں توسیع کرنے کا اختیار دے دیا گیا۔

۶۔ اسمبلی کے پہلے اسپیکر (Speaker) کو نامزد کیا گیا لیکن بعد میں ارکان اسمبلی میں سے اس کا انتخاب ہونا قرار پایا۔

۷۔ صوبائی اسمبلی میں توسیع کر دی گئی اور ارکان کی تعداد 100 مقرر کی گئی جن میں سے 70 ارکان منتخب اور 30 نامزد ہونگے۔

۸۔ صوبائی اسمبلی کی میعاد تین سال مقرر کی گئی لیکن اس میں توسیع کا اختیار بھی گورنر کو دے دیا گیا۔

۹۔ صوبائی وزیروں کو چند ایک معاملات طے کرنے کا اختیار دے دیا گیا مگر اہم امور گورنر اور اس کی ایگزیکٹو کونسل (Executive Council) کے تحت رکھے گئے۔

۱۰۔ صوبائی ایگزیکٹو کونسل کے سرکاری ارکان کو مجلس قانون ساز کی بجائے وزیر ہند کو جواب دہ بنا دیا گیا۔

۱۱۔ مرکزی مقننہ کو اختیار دے دیا گیا کہ وہ برٹش انڈیا کے متعلق کسی قسم کا کوئی قانون بنا سکتی ہے۔

۱۲۔ مرکزی مجلس قانون ساز کو رائج الوقت قوانین منسوخ کرنے یا ان میں ترمیم کرنے کا اختیار بھی دے دیا گیا

۱۳۔ اس ایکٹ کے تحت مرکزی اور صوبائی امور کی واضح حد بندی کر دی گئی۔

۱۴۔ اسمبلی کے ارکان کو آزادی تقریر کی اجازت دے دی گئی اور انہیں حکومت پر سوالات کرنے کی اجازت بھی مل گئی البتہ بجٹ پر بحث کرنے سے روک دیا گیا۔

۱۵۔ فوج، مواصلات، تجارت، محاصل، کرنسی اور نظم و نسق کے محکمے مرکز کے سپرد کر دیئے گئے۔ تعلیم، زراعت، صحت اور پولیس کے مقامی محکمے صوبائی حکومت کو دے دیئے گئے۔ جبکہ مالگذاری، جنگلات، عدالت، جیل خانے اور مزدوروں کے مسائل گورنروں کے خصوصی اختیارات میں شامل کر دیئے گئے۔

ردِعمل: اصل میں یہ نظام اور اصلاحات کافی مشکل اور ناقابلِ فہم تھیں۔ عملی طور پر ان کے نفاذ مشکل تھا۔ پھر صوبوں میں وزراء اور گورنر اس کے مجلس عاملہ کے درمیان تقسیم اختیار کے اس نظام کو دو عملی نظام کہا گیا۔ اس ایکٹ کی ساری دفعات سیاسی جماعتوں کی توقعات اور ان کے مطالبات سے بہت ہی کم تھیں چنانچہ کانگریس نے انہیں بالکل رد کر دیا۔ مسلم لیگ نے اس اصلاحات کو رد تو نہ کیا مگر ان کے تحت منعقد ہونے والے انتخابات میں حصہ نہ لیا۔ اس ایکٹ کی رو سے نافذ ہونے والی اصلاحات سے اگرچہ بہت سے ہندوستانیوں کو حکومت میں حصہ لینے کی اجازت مل گئی تھی مگر حکم کا عصا انگریز کے ہاتھ میں رہا اور مرکزی قانون ساز اسمبلی ہونے کے باوجود ان کی مقننہ وائسرائے کی خوشنودی اور قبولیت کی محتاج تھی۔ عجیب بات تو یہ تھی کہ انگریزوں نے ہندوستان کے مقابلہ میں بلقانی ریاستوں جیسے چھوٹے چھوٹے علاقوں کو تو حق خود اختیاری دے دیا تھا لیکن ان کے نزدیک ہندوستان کے 40 کروڑ عوام کو بھیڑ بکریوں کے گلے سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے تھے۔ چنانچہ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عوام میں سخت بے چینی پھیل گئی اور ایک مرتبہ پھر انقلاب برپا کرنے کے لئے اسلحہ اکٹھا کیا جانے لگا۔

رولٹ ایکٹ

فروری 1919ء میں حکومتِ ہند نے دفاعی قوانین کے تحت مرکزی اسمبلی میں ایک بل پیش کیا جسے "رولٹ ایکٹ" کہتے ہیں یہ

ایکٹ دو مسوداتِ قانون پر مشتمل تھا جس کمیٹی نے یہ ایکٹ پیش کیا تھا اس کے صدر مسٹر سڈنی رولٹ تھے اس لئے اس رولٹ ایکٹ کہا جاتا ہے۔

رولٹ ایکٹ کے نکات: اس ایکٹ کے تحت جو بل مرکزی اسمبلی میں پیش کیا گیا اس کی دفعات اور نکات یہ تھے:

۱۔ کسی بھی ہندوستانی کو وجہ بتائے بغیر گرفتار کیا جا سکتا ہے۔
۲۔ اس قانون کے تحت سزا پانے والے شخص کو اپیل کا حق نہیں دیا گیا تھا۔
۳۔ گرفتار ہونے والے شخص کو شہادت کے بغیر ہی سزا دی جا سکتی ہے۔
۴۔ اس قانون کے تحت اخبارات کی آزادی سلب کر دی گئی۔
۵۔ اس قانون کے تحت عدالتی اختیارات عاملہ کے سپرد کر دیئے گئے تھے۔

رولٹ ایکٹ کے خلاف ردِ عمل: یہ ایکٹ بہت ہی جابران کا حامل تھا۔ اس ایکٹ کی رو سے ہندوستان بھر کے اخبارات کی آزادی سلب کر لی گئی اور حکام کو یہ اختیار دے دیا گیا کہ وہ کسی بھی الزام میں وجہ بتائے بغیر جسے چاہیں گرفتار کر لیں۔ اس ایکٹ کے خلاف پورے ملک مین احتجاج کیا گیا گاندھی جی نے اعلان کر دیا کہ وہ اس ایکٹ میں مجوزہ قوانین کے خلاف ستیہ گرہ کریں گے۔

قائداعظم نے اس ایکٹ کے خلاف اپنے غم و غصہ کا اظہار اس طرح کیا کہ "مجرمانہ سیاسی سازش کا مسئلہ رپلٹ کمیٹی نے اس طرح پیدا کیا ہے گویا ہندوستان میں تمام جرائم پیشہ لوگ آباد ہیں۔ اس بل میں ہندستانی اراکین کی رائے اور عوام کے جذبات کا بالکل احترام نہیں کیا گیا۔ اس کمیٹی کی سفارشات ایسی نہیں ہیں جنہیں کوئی شائستہ حکومت تسلیم کر لے۔ ایسی سفارشات کے بارے میں سوچا بھی نہیں جا سکتا۔"

ان سیاہ قوانین کے خلاف سخت ردِ عمل ہوا۔ پورے ہندوستان میں جلسے ہوئے جلوس نکالے گئے۔ جلوس پر گولی چلی اور سارے ہندوستان میں ہڑتالیں ہوئیں۔ اس طرح سارے ملک میں افراتفری اور بدنظمی پھیل گئی۔ قائداعظم نے مجلس قانون ساز کی رکنیت سے استعفیٰ دے دیا۔ اور گاندھی جی نے قیصر ہند کا اعزاز واپس کر دیا۔ اسی ایکٹ کی وجہ سے 10 اپریل 1919ء کو امرتسر میں جلیانوالہ باغ کا حادثہ پیش آیا۔

☆

تحریک خلافت کے مقاصد اور برصغیر کی سیاست میں اس کا کردار:

تحریک خلافت کا پس منظر: 1911ء میں اٹلی نے طرابلس پر حملہ کر دیا جب ترکی نے اٹلی کے مقابلے کے لئے مصر کے راستے سے اپنی فوج کو بھیجنا چاہا تو انگریزوں نے مصر کے راستے سے ترک فوج کو گذرنے کی اجازت نہ دی۔ اس لمرح اٹلی نے طرابلس پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد 1912ء میں ترکی کی ماتحت بلقان ریاستوں مے متحد ہو کر ترکی کے خلاف بغاوت کر دی۔ بلقان کی باغی ریاستوں کی حمایت میں انگریز بھی سرگرم عمل ہو گئے کیونکہ انگریز مسلمانوں کی مرکزی سلطنت "ترکی" کو پرصورت میں ختم کرنا چاہتے تھے حالانکہ ہو ترکی کے سب سے بڑے ہمدرد ہونے کے دعویدار تھے۔ روس نے اس صورت حال سے فائدہ اٹھا کر بلقان کی ریاستوں پر حملہ کر دیا۔ اس طرح بلقان کا علاقہ بھی ترکی کے قبضہ سے نکل گیا اور انگریز ترکی کی خلاف جنگ میں شامل ہوا۔ ترکی کی مسلمہ مرکزی سیاسی و مذہبی حقیقت کے باعث مسلمانان ہند نے ترکی کی خلافت کی بقاء کے لئے تحریک خلافت کی حمایت کی۔

مجلسِ خلافت کا قیام: تحریکِ خلافت کو چلانے کے لئے سب سے پہلے ایک مجلسِ خلافت کی بنیاد رکھی گئی۔ مجلس خلافت کا مقصد یورپی ممالک کی ریشہ دوانیوں کو روک کر مسلمانوں کے مستقبل کو محفوظ کرنا اور ترقی کی خلافت کو بحال کرانا تھا۔ مجلس خلافت میں مولانا عبدالباری فرنگی محل، مولانا آزاد سبحانی، مولانا عبدالماجد بدایونی، مولانا حسرت موہانی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی، مولانا ظفر علی خان، حکیم اجمل خان، مولانا سید سلیمان ندوی، ڈاکٹر انصاری اور سیٹھ محمد چھوٹانی شامل تھے۔ ان تمام حضرات نے تحریکِ خلافت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور تحریک کے صفِ اوّل کے رہنماؤں میں جگہ پائی۔

تحریکِ خلافت کے اثرات: تحریکِ خلافت میں مسلمانوں نے بے پناہ تکالیف برداشت کیں اور خلافتِ ترکی کو بچانے کے لئے ہر طرح کی قربانیاں دیں مگر تحریکِ خلافت کامیاب نہ ہو سکی لیکن اس کے باوجود اس تحریک نے برصغیر کی سیاست میں دوررس اثرات چھوڑے۔

۱۔ اس تحریک نے مسلمانوں میں جذبہ جہاد ابھارا۔

۲۔ اس تحریک نے مسلمانوں میں سیاسی بیداری پیدا کی۔
۳۔ اس تحریک نے عوام اور رہنماؤں میں گہرا تعلق پیدا کر دیا۔
۴۔ اس تحریک نے ہندوستان کے تمام مسلمانوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کیا۔
۵۔ اس تحریک نے پاکستان کے قیام کا راستہ ہموار کر دیا۔

برصغیر کی سیاست میں تحریکِ خلافت کا کردار: ہندوستان میں اگرچہ یہ تحریک اپنے معینہ مقاصد پوری طرح حاصل نہ کر سکی لیکن پھر بھی اس نے برصغیر کی سیاست پر گہرے اثرات چھوڑے۔ اس تحریک سے ہندوستان میں حکومت برطانیہ ڈگمگا کر رہ گئی۔ اس تحریک نے مسلمانوں میں سیاسی بیداری پیدا کر کے ان کو آزادی کے راستے پر لگا دیا۔ یہی تحریک وہ تحریک تھی جو مسلمانوں کی آزادی کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ اس تحریک نے برصغیر میں بڑے بڑے مسلم لیڈر پیدا کر کے انہیں قوم کی قیادت کے لئے تیار کر دیا اور جب تحریک پاکستان اپنے عروج پر پہنچی تو اسی تحریک کے پیدا کردہ لیڈر قائدِ اعظم کے ساتھ مل کر قیامِ پاکستان کے لئے جدوجہد کرنے لگے اور بالآخر تحریک خلافت کے ہموار کردہ راستہ پر چل کر مسلمان علیحدہ مملکت کے حصول میں کامیاب ہو گئے۔

سائمن کمیشن

سائمن کمیشن 8 نومبر 1927 کو ہندوستان کے وائسرائے لارڈ ارون نے سر جان سائمن کی قیادت میں مقرر کیا۔ یہ کمیشن چھ ارکان پر مشتمل تھا اس کے تمام ارکان انگریز تھے اور اس کمیشن کے وفد میں کسی ہندوستانی کو شامل نہیں کیا گیا تھا۔ اس کمیشن کو کام ہندوستان کے سیاسی حالات اور دستور کا جائزہ لے کر حکومت برطانیہ کے سامنے ایک تفصیلی رپورٹ پیش کرنا تھا چنانچہ 3 فروری 1928ء کو یہ کمیشن بڑے ٹھاٹھ باٹھ کے ساتھ ہندوستان پہنچا۔ اس کمیشن کی آمد پر پورے ہندوستان میں مظاہر اور فسادات ہوئے مگر مخالفت کے باوجود اس نے اپنی رپورٹ حکومت برطانیہ کے سامنے پیش کر دی۔

تجاویز:

۱۔ ہندوستان کے لئے وفاقی نظام رائج کیا جائے۔ مرکز کے اختیارات ضرورت کے مطابق صوبوں کو منتقل کر دیئے جائیں۔
۲۔ صوبوں میں ایسی حکومتیں قائم کی جائیں جو اپنے اختیارات کے استعمال کے معاملات میں مجلس قانون ساز کے سامنے جوابدہ ہوں۔
۳۔ صوبوں کی حکومتیں برطانیہ کے نظام کے مطابق نہ ہوں۔
۴۔ صوبہ سرحد کے لئے ایک قانون ساز مجلس قائم کی جائے۔
۵۔ سندھ کو بمبئی سے علیحدہ کر کے الگ صوبہ بنانے پر توجہ دی جائے۔
۶۔ حقِ رائے دہی کا دائرہ وسیع کر دیا جائے۔
۷۔ مرکزی حکومت کو نہایت مستحکم اور مضبوط بنایا جائے۔

سائمن کمیشن کے خلاف ردِ عمل: جب سائمن کمیشن ہندوستان پہنچا تو کانگریس اور مسلم لیگ نے اس کے ساتھ تعاون کرنے سے انکار کر دیا۔ کمیشن سے تعاون نہ کرنے کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ اس کے وفد میں کسی ہندوستانی کو شامل نہیں کیا گیا تھا۔ قائدِ اعظم محمد علی جناح نے سائمن کمیشن پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ اس کمیشن میں کسی ہندوستانی کو شامل نہ کر کے حکومت برطانیہ نے سخت غلطی کی ہے۔ اس موقع پر مسلم لیگ اور کانگریس نے بمبئی میں ایک جلسہ منعقد کیا جس میں قائدِ اعظم محمد علی جناح نے تقریر کرتے ہوئے فرمایا "سائمن کمیشن واپس جاؤ" قائد کا یہ نعرہ پورے ہندوستان میں پھیل گیا۔

نہرو رپورٹ 1928 اور اسکے نتائج

سائمن کمیشن سے بائیکاٹ میں کانگریس اور مسلم لیگ تقریباً ہم خیال تھی اس کمیشن کی سفارشات ابھی پالیمنٹ میں پیش بھی نہ ہوئی تھیں کہ ہندوستان میں اس کی تشکیل، اس کی کارروائیوں اور اس کی حیثیت کے بارے میں ہیجان برپا ہو گیا اس پر برطانوی وزیر امور ہند مسٹر برکن ہیڈ نے برہم ہونا شروع کر دیا اور اس نے پارلیمنٹ میں ایک بیان دیتے ہوئے کہا کہ "ہندوستانی اس درجہ منقسم، مختلف الخیال اور ایک دوسرے سے بیزار ہیں کہ وہ ایک متحدہ دستورِ اساسی بھی نہیں بنا سکتے"۔ ہندوستانیوں کے لئے یہ ایک کھلا چیلنج

تھا انڈین نیشنل کانگریس نے اس چیلنج کا جواب دینے کے لئے 12 فروری 1928 کو آل پارٹیز کانفرنس دہلی میں بلائی۔ اس کانفرنس میں ہندوؤں، مسلمانوں اور دوسری اقوام کے نمائندے شریک ہوئے اور یہ طے ہوا کہ ایک دستور اساسی بنایا جائے اور ہندوستان کے مطالبات کی صورت میں حکومت کے سامنے پیش کیا جائے اس کانفرنس نے باقاعدہ دستور سازی کے لئے کمیٹی تشکیل دی جسے ہندوستان کے دستورِ اساسی کا کام سونپا گیا اس کمیٹی کے سربراہ پنڈت لال نہرو مقرر ہوئے اس کمیٹی میں دو مسلمان ارکان سر علی امام اور جناب شعیب قریشی بھی شامل تھے لیکن اکثریت ہندوؤں کی تھی۔ اس لئے اس کانفرنس میں کوئی خاص فیصلہ نہ ہو سکا۔ آخر کار اس کمیٹی کا اجلاس 19 مئی 1928ء کو بمبئی میں دوبارہ ہوا اس اجلاس میں مسلمانوں کی طرف سے مولانا شوکت علی اور ڈاکٹر انصاری نے شرکت کی اس اجلاس میں مسلمانوں کی کھل کر مخالفت کی گئی اس سے مسلمانوں کے دلوں میں ہندوؤں کے خلاف نفرت کی لہر دوڑ گئی۔ بہر حال مقررہ کردہ کمیٹی نے جو سفارشات مرتب کیں انہیں ہندوستان کی سیاسی تحریک میں "نہرو رپورٹ" کہتے ہیں۔ پس اس طرح نہرو رپورٹ سائمن کمیشن کے ایجنڈے میں 19 مئی 1928 کو شائع کی گئی۔

نہرو رپورٹ کے اہم نکات: نہرو رپورٹ میں جو سفارشات پیش کی گئی ان کی تفصیل مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ برصغیر ہندوستان کو خود مختارانہ حیثیت کی ایک ذمہ دار حکومت عطا کی جائے۔

۲۔ اردو کے بجائے ہندی کو سرکاری زبان بنایا جائے۔

۳۔ جداگانہ انتخابات کے اصول کو منسوخ کر کے مخلوط انتخابات کا طریقہ رائج کیا جائے۔

۴۔ ہندوستان میں وفاقی نظام کے بجائے وحدانی نظام رائج کیا جائے۔

۵۔ مرکزی مجلس قانون میں مسلمانوں کو 1/4 حصہ نشستیں دی جائیں۔

۶۔ امورِ دفاع و خارجہ انگریز کے سپرد ہی رہنے دیئے جائیں۔

۷۔ جنوبی ہندوستان میں ایک نئے ہندو صوبے کا قیام عمل میں لایا جائے۔

۸۔ پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کی اکثریت کو تسلیم نہ کیا جائے۔

۹۔ بلوچستان کو مکمل صوبہ بنایا جائے۔

۱۰۔ مرکزی حکومت وزیر اعظم کے علاوہ چھ وزیروں پر مشتمل ہو جن کے تقرر کو گورنمنٹ خود کرے۔

نہرو رپورٹ کے نتائج: نہرو رپورٹ نے مسلمانوں کے حقوق کو یکسر پامال کر دیا اور مسلمانوں کو سیاسی تحفظ دیئے بغیر جداگانہ طریقہ انتخاب ختم کر کے مضبوط مرکز پر مبنی دستور کی سفارش کی۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ مسلمانوں میں اپنی تہذیب، ثقافت اور اسلام سے جو عقیدت پائی جاتی ہے وہ ختم ہو جائے اور ان میں ہندوستانی قومیت کا جذبہ پیدا ہو جائے۔ اصل میں اس رپورٹ کو آڑ میں ہندو مسلمانوں پر اپنی راج دھانی قائم کرنے کا راستہ ہموار کر رہے تھے۔

قائدِ اعظم کے چودہ نکات اور ان کی اہمیت

ہندوؤں نے 1928ء میں ایک رپورٹ پیش کی جو نہرو رپورٹ مسلمانوں کے لئے ایک کھلا چیلنج تھی اس رپورٹ کی تمام شرائط ہندوؤں کے مفادات سے وابستہ تھیں اور اس میں مسلمانوں کے مفادات کا تحفظ نہیں کیا گیا تھا۔ مسلمانوں کے تمام مطالبات اور تجاویز رد کر دی گئی تھیں۔ چنانچہ قائدِ اعظم نے نہرو رپورٹ کے جواب میں اپنے چودہ نکات پیش کئے انہیں نکات نے مسلمانوں کی آئینی جدوجہد کی راہیں متعین کیں۔

قائدِ اعظم کے چودہ نکات:

۱۔ قائدِ اعظم نے چودہ نکات 1929ء میں پیش کئے جو مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ ملک کا آئین وفاقی ہو۔

۲۔ تمام صوبوں کو یکساں حکومت خود مختاری دی جائے۔

۳۔ اقلیتوں کو مناسب نمائندگی دی جائے۔

۴۔ طریقہ انتخاب جداگانہ ہو۔

۵۔ مرکزی مجلس میں مسلمانوں کی تعداد ایک تہائی ہو۔

۶۔ سندھ کو الگ صوبہ بنایا جائے۔
۷۔ ملازمتوں میں مسلمانوں کو مناسب حصہ دیا جائے۔
۸۔ مسلمانوں کی تہذیب وتمدن اور زبان وادب کو آئینی تحفظ دیا جائے۔
۹۔ مرکز اور صوبوں میں کوئی ایسی وزارت قائم نہ کی جائے جس میں مسلم وزراء کی تعداد ایک تہائی نہ ہو۔
۱۰۔ کوئی ایسا مسودہ قانون منظور نہ کیا جائے جس کی مخالفت کسی فرقہ کے نمائندوں کی 4-3 تعداد کرے۔
۱۱۔ شمالی مغربی سرحدی صوبہ اور بلوچستان میں بھی دوسرے صوبوں کی طرح اصلاحات نافذ کی جائیں۔
۱۲۔ تمام فرقوں کو مذہبی اجتماع کی آزادی، رسم ورواج اور عبادت کی آزادی ہوگی۔
۱۳۔ صوبوں کی ایسی منصوبہ بندی نہ کی جائے جس سے مسلم اکثریت متاثر ہو۔
۱۴۔ دستور میں ترمیم کے لئے وفاق کی تمام اکائیوں کی منظوری ضروری ہوگی۔

برصغیر ہندوستان پر چودہ نکات کے اثرات: برصغیر ہندوستان کی تاریخ میں قائد اعظم کے چودہ نکات کے بے حد اہمیت حاصل ہے۔ ان نکات نے مسلمانوں کی آئینی جدوجہد کی راہیں متعین کردیں۔ کیونکہ یہ نکات مسلمانوں کے جذبات کی مکمل عکاسی کرتے تھے اور انگریزوں نے بھی اس بات کو تسلیم کیا کہ جہاں تک مطالبات کا تعلق ہے وہ ہندوؤں کے مطالبات کے مقابلے میں زیادہ مناسب اور بہتر ہیں اور انہی مطالبات کی ضمانت کا تصور خود حکومتِ برطانیہ نے بھی دیا تھا۔

قائد اعظم کے یہ چودہ نکات تاریخ میں کافی اہمیت کے حامل ہیں اس لئے کہ ان میں جناح کی پالیسی اور ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے ان کے مطالبات کا راز مضمر ہے۔ لندن میں تینوں گول میز کانفرنسوں میں محمد علی جناح اور دوسرے مسلم قائدین نے وہی مؤقف اختیار کیا جو چودہ نکات میں شامل کیا گیا تھا۔ اس طرح چودہ نکات نے اہم معاملات کو سلجھانے کے لئے راستہ ہموار کردیا۔ مسلم لیگ چودہ نکات کی روشنی میں قیام پاکستان کی کوشش کرتی رہی۔

علامہ اقبال کا خطبہ الہٰ آباد اور اسکی تاریخی اہمیت 1930ء

علامہ اقبال ایک عظیم مفکر اور مدبر تھے ان میں فہم وفراست کوٹ کوٹ کر بھری تھی وہ مسلمان قوم کے مسیحا تھے وہ ایک آزاد منش آدمی تھے اور غلامی کی زنجیروں میں جکڑے رہنے کو پسند نہیں کرتے تھے۔ اس لئے انہوں نے پاک وہند کے مسلمانوں میں زندگی کی نئی روح پھونکنے اور خفتہ قوم کو جگانے کا تہیہ کرلیا اسی سلسلے میں انہوں نے اپنی شاعری، تحریروں اور تقریروں کو سہارا بنایا۔

خطبہ الہٰ آباد کے مندرجات: الہٰ آباد میں مسلم لیگ کا جلسہ 29 اور 30 دسمبر 1930ء کو ہوا جس میں علامہ اقبال نے صاف صاف کہہ دیا کہ میں پنجاب، صوبہ سرحد، صوبہ سندھ اور بلوچستان کو ایک مملکت دیکھنا چاہتا ہوں اور یہ میں دیکھ رہا ہوں کہ شمالی مغربی اسلامی ریاست کم سے کم شمالی مغربی ہندوستانی مسلمانوں کے لئے مقدر ہوچکی ہے۔ اس خطبے کے مندرجات یہ تھے۔

۱۔ اس خطبہ میں علامہ اقبال نے حالات واقعات کا بھرپور انداز میں جائزہ لیا اور پھر مسلمانوں کے افکار وخیالات کا اظہار کرنے کے بعد مسلمانوں کی عظمت رفتہ کا ذکر کیا۔

۲۔ علامہ نے فرمایا کہ "ہندوستان کے مختلف مذاہب اور متعدد ذاتوں میں اس قسم کا کوئی رجحان موجود نہیں ہے کہ وہ اپنی انفرادی حیثیت ترک کرکے ایک وسیع جماعت کی صورت اختیار کرلیں یہی وجہ ہے کہ باہمی اشتراک کی تمام کوششیں ناکام ہوچکی ہیں اس لئے مسلمانوں کو اپنی ترقی اور بقا کے لئے آزادی کی راہ متعین کرنا چاہیے۔"

۳۔ علامہ صاحب نے فرمایا کہ "ہندوستان دنیا بھر میں سب سے بڑا اسلامی ملک ہے اس ملک میں اسلام بحیثیت ایک تمدنی قوت کے اسی صورت میں زندہ رہ سکتا ہے کہ اسے ایک مخصوص علاقے میں مرکوز کردیا جائے اگر یوں ایک مرکزیت قائم کردی جائے تو نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام ایشیاء کی گتھیاں سلجھ جائیں گے۔"

۴۔ علامہ اقبال نے فرمایا کہ میں مسلمانانِ ہندوستان کو کبھی یہ رائے نہیں دونگا کہ وہ ایسے نظامِ حکومت سے اتفاق کرلیں جو حقیقی فیڈریشن کے اصول پر مبنی ہو یا جس میں ان کے سیاسی وجود کو تسلیم نہ کیا جائے۔

۵۔ علامہ اقبال نے فرمایا کہ دو آئینی مسئلوں کے متعلق ہم مسلمانوں کو کیا طرز عمل اختیار کرنا چاہئے ہمارا سب سے بڑا مطالبہ یہ ہے کہ فرقہ ورانہ مسائل کے مستقل تصفیئے کے لئے برطانوی ہندوستان میں صوبوں کی تقسیم از سرنو کی جائے لیکن اگر مسلمانوں کا یہ مطالبہ

مسترد کر دیا جائے تو پھر ہندوستان کے مسلمان کسی ایسی آئینی تبدیلی کو قبول کرنے کیلئے تیار نہ ہوں گے جس کے تحت وہ بنگال اور پنجاب میں جداگانہ انتخابات کے ذریعے اپنی اکثریت حاصل نہ کر لیں یا مرکزی مجلس میں انہیں 33 فیصد نشستیں نہ مل جائیں۔

۶۔ ایک مسلم ریاست کے قیام کی وضاحت کرتے ہوئے علامہ اقبال نے فرمایا کہ ہندو اور مسلم دو الگ قومیں ہیں ان کی ثقافت الگ ہے ان کا مذہب الگ ہے اس لئے ان کے تمدن اور معاشرت میں ہم آہنگی پیدا نہیں ہو سکتی لہذا برصغیر کے مسائل کا حل یہی ہے کہ ہندوستان کے اندر مسلمانوں کی جداگانہ اور خود مختار ریاست قائم ہو۔ لہذا میری خواہش ہے کہ پنجاب، سرحد، سندھ اور بلوچستان کو ایک ریاست میں ملا دیا جائے۔

خطبہ الہ آباد کو برصغیر کے سیاسی افق کے حوالے سے بڑی اہمیت حاصل ہے اس خطبہ سے مسلمانوں کی علیحدہ قومیت کا نظریہ پوری طرح واضح ہو گیا اور اسلام کے سیاسی تصورات مسلمانوں کے سامنے واضح صورت میں عیاں ہو گئے اور اس طرح یہ خطبہ مسلمانوں کے لئے روشنی کا ایک مینار ثابت ہوا جس نے مسلمانوں کو نئی راہ دکھائی اور ایسی منزل کی نشاندہی کی جس کے بغیر ان کے مسائل کا حل ممکن نہ تھا۔

گول میز کانفرنسیں 32-1930ء

1930 سے 1932ء کے درمیانی عرصے میں لندن میں برطانوی حکومت نے آئینی اصلاحات کی نئی قسط کا فیصلہ کرنے کے لئے مذاکرات کا سلسلہ شروع کیا جسے گول میز کانفرنسوں کا نام دیا گیا۔

انعقاد کا مقصد: گول میز کانفرنسوں کے انعقاد کے مقاصد درج ذیل ہیں:

۱۔ برصغیر کے سیاسی مسائل کا حل تلاش کرنا۔
۲۔ ہندوستانیوں کے لئے آئینی حکومت بنانے پر غور کرنا۔
۳۔ فرقہ وارانہ مسائل کا حل تلاش کرنا۔
۴۔ برصغیر ہندوستان میں امن و امان بحال کرنے کے لئے کوئی تیار فارمولا تیار کرنا۔

پہلی گول میز کانفرنس: یہ کانفرنس 12 نومبر 1930ء کو لندن میں شروع ہوئی اور 19 جنوری 1931ء تک جاری رہی۔ اس کانفرنس میں ہندوستان کے وائسرائے نے 57 مندوبین کو شرکت کی دعوت دی تھی جن میں ہندو اور مسلمان شامل تھے مگر کانگریس نے اس کانفرنس میں شرکت کرنے سے انکار کر دیا۔ جن ہندو رہنماؤں نے شرکت کی ان کے نام یہ ہیں۔

۱۔ ڈاکٹر مونجے ۲۔ مسٹر جیکر ۳۔ سر تیج

مسلم لیگ نے بھی اس کانفرنس میں شرکت کے لئے ایک وفد تشکیل دیا اس وفد میں مندرجہ ذیل قائدین شامل تھے۔

۱۔ سر آغا خان	۲۔ مولانا محمد علی جوہر	۳۔ محمد علی جناح
۴۔ مولوی فضل الحق	۵۔ سر شاہ نواز	۶۔ نواب سر احمد سعید چھتاری
۷۔ سر محمد شفیع	۸۔ علام حسین ہدایت اللہ	۹۔ چوہدری ظفر اللہ
۱۰۔ راجہ شیر محمد	۱۱۔ بیگم شاہ نواز	

مسلم لیگ کے وفد کی قیادت سر آغا خان کر رہے تھے لیکن اس وفد میں سب سے سرگرم رکن مولانا محمد علی جوہر تھے انھوں نے اس کانفرنس میں اپنا مؤقف بیان کرتے ہوئے فرمایا "میں ایک غلام ملک میں زندہ رہنے سے آزاد ملک میں مرنا بہتر سمجھتا ہوں میں یہاں سے ہندوستان کے لئے آزادی لے کر جاؤں یا اسی ملک میں اپنی قبر کے لئے جگہ لوں گا۔" اس کانفرنس میں بعض امور پر اتفاق ہو گیا تھا مگر کانگریس کی طرف سے مسٹر جیکر نے مسلمانوں کے خلاف زہر افشانی کر کے کانفرنس کا سارا ماحول خراب کر دیا اور اس کانفرنس کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔

دوسری گول میز کانفرنس: یہ کانفرنس سات ستمبر 1931ء کو شروع ہوئی اور یکم دسمبر 1931ء تک جاری رہی۔ اس کانفرنس میں مسلم لیگ کے سابقہ وفد نے شرکت کی البتہ اس وفد میں علامہ اقبال کو بھی شامل کر لیا گیا۔ کانگریس کی طرف سے مہاتما گاندھی نے شرکت کی۔ گاندھی کی شرکت کا مقصد کانفرنس کو ناکام بنانا تھا کہ اس طرح برطانوی حکومت کو کانگریس کے اثر کا پتہ چل جائیگا لہٰذا اس نے کانفرنس میں نہایت ہی قابل اعتراض رویہ اختیار کیا اس نے اعلان کیا کہ ہندوستان کی واحد سیاسی جماعت کانگریس ہے اور باقی

تمام جماعتیں ثانوی حیثیت رکھی ہیں اس لئے میں کسی بحث کو سننے کیلئے تیار نہیں ہوں، مسلم لیگ نے بھی اپنا مؤقف بیان کیا اور علامہ اقبال نے واشگاف الفاظ میں اعلان کیا کہ مسلمانوں کی سیاسی جمعیت مسلم لیگ ہے جو ہندوستان میں مسلم قوم کی نمائندگی کرتی ہے اقبال نے اس کانفرنس کے موقع پر وفد کے قائد جناب سر آغا خان کو نہایت عمدہ مشورے بھی دیئے۔

تیسری گول میز کانفرنس: یہ کانفرنس 17 نومبر 1932ء میں شروع ہوئی اور 24 دسمبر 1932ء تک جاری رہی۔ اس کانفرنس میں بھی کانگریس نے شرکت نہ کی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ہندوستان میں نافذ کی جانے والی اصلاحات کانگریس کیے میں تھیں اور کانگریس کے قائدین کو یہ خوف تھا کہ اگر کانفرنس میں شرکت کی گئی تو ہوسکتا ہے۔ برطانوی حکومت ان اصلاحات کے پیش نظر کسی مسئلے کے حل پر مجبور کردے۔

اس کانفرنس میں زیادہ تر ہندوستان کے آئینی معاملات پر بحث ہوئی۔ علامہ اقبال نے اس کانفرنس میں وفاق ہند کے بارے میں اپنا نقطہ نظر اس طرح پیش کیا کہ ہندوستان میں سرے سے کوئی مرکزی حکومت قائم نہ کی جائے بلکہ ہر صوبے کو آزاد ڈومینین بنادیا جائے جس کا تعلق ہندستان کی مرکزی حکومت کے بجائے براہ راست لندن میں وزیر ہند سے ہو۔ اس کانفرنس میں بھی کوئی حتمی فیصلہ نہ ہوسکا۔

نتائج: گول میز کانفرنسوں کے دوررس نتائج برآمد ہوئے ان کانفرنسوں میں ہندوؤں کا مؤقف پوری طرح عیاں ہوگیا تھا اور مسلمان یہ بات اچھی طرح سمجھ گئے تھے کہ کانگریس کسی صورت میں بھی مسلم لیگ کو مسلمانوں کی نمائندہ جماعت ماننے کے لئے تیار نہیں ہے۔

دستور ہند 1935:

شروع شروع میں یہ دستور جزوی طور پر نافذ کیا گیا مگر اس کا مکمل نفاذ 1937ء میں ہوا۔ اس آئین میں دوعملی نظام کا خاتمہ۔ صوبائی خودمختاری کا قیام اور ووٹ دہندگان کی تعداد میں اضافہ اہم پہلو تھے۔ اس دستور میں ہندستان کو وفاقی طرز حکومت دیا گیا اور وفاق کو تین حصوں میں تقسیم کردیا گیا۔ وفاقی کی تقسیم یہ تھی۔

(۱) برطانوی ہند کے صوبے جو گورنر کے ماتحت تھے۔ (۲) چیف کمشنریاں (۳) دیسی ریاستیں

وفاق کا حاکم گورنر تھا جس کا کام ہندوستان میں امن عامہ کو برقرار رکھنا، اقلیتوں کا تحفظ کرنا اور دیسی ریاستوں کے حقوق اور والیان ریاست کے مراتب کا تحفظ کرنا تھا اس کے علاوہ محکمہ دفاع اور امور مالیات بھی اس کی نگرانی میں تھے۔

خصوصیات:

۱۔ ہندوستان میں وفاقی طرز حکومت قائم کردی گئی۔
۲۔ وفاق میں صوبے اور ریاستیں شامل کردی گئیں۔
۳۔ وفاق کے لئے دوایوانی مقننہ تجویز کی گئی۔
۴۔ اسمبلیوں کے لئے نمائندوں کی تعداد مقرر کی گئی۔
۵۔ اسمبلیوں کے نمائندوں کی مدت پانچ سال ہوگئی۔
۶۔ صوبوں میں دوعملی نظام رائج کیا گیا۔
۷۔ صوبوں کو علاقائی آزادی اور خودمختاری کا حق دیا گیا۔
۸۔ دستور ہند 1935ء کے تحت سیکریٹری آف اسٹیٹ یعنی وزیر ہند کی کونسل کو ختم کردیا گیا اور اس کی مدد کے لئے مشیر مقرر کئے گئے جس کی تعداد کم از کم 3 اور زیادہ سے زیادہ 6 مقرر کی گئی۔
۹۔ وفاقی عدالت قائم کی گئی جو ملک کی سب سے بڑی دالت تھی اسے براہ راست مقدمات اور اپلیں سننے کا اختیار دیا گیا اور اس کے ماتحت ہر صوبے میں ایک ماتحت عدالت عالیہ قائم کی گئی۔

بہرحال ہندوستان کے عوام جس جمہوریت اور آزادی کا مطالبہ کررہے تھے وہ اس دستور نے بھی پورا نہ کیا تاہم مسلم لیگی قائدین نے مصلحت کی بناء پر اسے قبول کرلیا اور مسلمانوں سے اپیل کی کہ وہ وقتی طور پر اس دستور سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں اور صوبائی اسمبلیوں کے انتخاب میں حصہ لیں۔ 1936ء میں جب اس ایکٹ کے تحت انتخابات شروع ہوئے تو تمام سیاسی جماعتوں نے انتخابات میں حصہ لیا ان انتخانات میں بھی کانگریس اپنے آپ کو ہندوستان کی واحد نمائندہ جماعت ثابت نہ کرسکی۔

Lecturer SHAIKH ASIF IQBAL ZAHOORI

قراردادِ پاکستان کے اغراض و مقاصد کا تفصیلی جائزہ

قراردادِ پاکستان کا پس منظر بڑا طویل ہے۔ اس کا آغاز اس وقت ہو چکا تھا جب دسمبر 1938ء کے بعد مسلم لیگ نے وفاقی طرز حکومت کی تجویز مسترد کر کے لیگ کے صدر کو یہ اختیار دے دیا تھا کہ وہ مسلمانوں کیلئے کوئی بہتر اور متبادل آئینی اسکیم پیش کریں۔ اس سلسلے میں مارچ 1939ء میں مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی کا اجلاس میرٹھ میں منعقد ہوا جس میں کمیٹی تشکیل دے کر جلد از جلد آئینی تجاویز پیش کرنے کا فیصلہ ہوا تا کہ مسلم لیگ کسی حتمی نتیجہ پر پہنچ سکے۔

مسلم لیگ کا ستائیسواں سالانہ اجلاس: قرار دادِ پاکستان کے سلسلے مسلم لیگ کا ستائیسواں اجلاس تین دن تک جاری رہا۔ 21 مارچ 1940ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کا اجلاس ہوا جس میں آئندہ اجلاس کی قرارداد کا مسودہ تیار کیا گیا کونسل کا یہ اجلاس نواب آف ممدوٹ کے گھر پر ہوا تھا۔ دوسرا اجلاس 22 مارچ 1940ء کو منٹو پارک میں ہوا جس میں نواب ممدوٹ نے مہمانوں کا خیر مقدم کیا اور خطبہ استقبالیہ پیش کیا قائداعظم نے اس اجلاس سے خطاب کیا اور سامعین کے سامنے ہندوستان کی سیاسی صورت حال کا جائزہ پیش کیا۔ قراردادِ لاہور کا تیسرا تاریخی اجلاس 23 مارچ 1940ء کو منٹو پارک لاہور میں منعقد ہوا اس اجلاس میں حاضرین کی تعداد ایک لاکھ سے بھی زیادہ تھی۔ اجلاس کی صدارت قائداعظم نے کی۔ قرارداد شیر بنگال مولوی فضل الحق نے پیش کی۔ مولوی فضل الحق اس وقت بنگال کے وزیر اعلیٰ تھے۔

قراردادِ لاہور کے مقاصد: یہ قرارداد تاریخ ساز تھی یہی قرارداد ایک علیحدہ مسلم ریاست کے قیام کا پیش خیمہ ثابت ہوئی اس کے مقاصد یہ تھے۔

۱۔ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ موجودہ صورت حال میں مسلمانانِ ہند کیلئے نا قابل قبول ہے۔

۲۔ حکومت برطانیہ نے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ میں ردوبدل کا جو اعلان کیا ہے اس سے مسلمانانِ ہند اس وقت تک مطمئن نہیں ہو سکے جب تک پوری آئینی اسکیم از سرنو مرتب نہ کی جائے اور ترمیم شدہ دستور خاکہ اس وقت تک نا قابل قبول ہوگا جب تک اس کے لئے مسلمانوں کی رضامندی اور منظور حاصل نہ کر لی جائے۔

۳۔ جن علاقوں میں آبادی کے لحاظ سے مسلمانوں کی اکثریت ہے ان کو آپس میں ملا دیا جائے تا کہ وہاں مسلمان آزاد مملکت بنا سکیں۔

۴۔ آزاد علاقوں اور خودمختار وحدتوں میں آباد مسلم اقلیتوں سے مشورہ لیا جائے اور دستوری خاکہ میں ان کے مفادات کی حفاظت کی ضمانت دی جائے۔

۵۔ ایسے خطے جہاں خاص طور پر مسلمانوں کی اقلیت ہے وہاں مناسب اور موثر تحفظات فراہم کئے جائیں۔

قرارداد میں یہ بھی واضح کر دیا گیا تھا کہ مسلمان اور ہندو دو الگ قومیں ہیں ان کا مذہب، تہذیب اور تصورات جداگانہ ہیں وہ ایک دوسرے کے ساتھ مل کر نہیں رہ سکتے مسلمان ہر اعتبار سے ایک قوم ہیں ان کا اپنا وطن اور علاقہ ہونا چاہئے جہاں وہ اپنی روایات کے مطابق زندگی بسر کر سکیں۔

قراردادِ لاہور کی تائید: اس قرارداد کی تائید سب سے پہلے چودھری خلیق الزماں نے کی۔ ان کے بعد دوسرے اہم رہنماؤں نے اس کی بھرپور حمایت کا اعلان کیا۔ قرارداد کی تائید اور حمایت کرنے والوں میں مولانا ظفر علی خان، حاجی سر عبداللہ ہارون اور قاضی عیسیٰ پیش پیش تھے بعدازیں قرارداد کو کثرت رائے سے منظور کر لیا گیا۔

قراردادِ لاہور کی اہمیت: قراردادِ لاہور کی منظوری سے ہندوستان کی سیاست نے نئی کروٹ لی۔ اس کی روش اور رویے میں انقلاب آ گیا۔ یہ قرارداد قیامِ پاکستان کا پیش خیمہ بن گئی اس کی منظوری سے ہندوؤں کے خواب ملیامیٹ ہو گئے اور یہ ان کی وحدت پر ضرب کاری ثابت ہوئی، ایک بار قائداعظم نے لاہور سیشن کے بارے میں اعلان فرمایا تھا کہ "مسلم لیگ سیشن اسلامی ہند کی تاریخ میں ایک نئے باب کا افتتاح کریگا کیونکہ اس اجلاس میں اہم فیصلے کئے جا رہے ہیں"

قائداعظم کا یہ فرمان پورا ہوا کیونکہ اس اجلاس کے بعد مسلم لیگ محمد علی جناح کی قیادت میں پوری آب و تاب کے ساتھ میدان عمل میں اتر آئی تھی۔ پس اس قرارداد نے تصور پاکستان کو حقیقت کا روپ دے دیا۔

1942ء کرپس مشن کی سفارشات اور ہندوؤں کا ردعمل

دوسری جنگ عظیم کے ابتدائی سالوں میں جرمنی نے برطانیہ کو ہر محاذ پر پسپا ہونے پر مجبور کر دیا۔ برطانیہ پر پڑنے والے اس دباؤ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہندوستان میں بھی سیاسی جماعتوں نے زیادہ سے زیادہ اپنے حق میں انگریز حکومت سے مطالبات منوانے کیلئے دباؤ ڈالنا شروع کر دیا تھا۔ اس وقت برطانیہ کا وزیر اعظم مسٹر ونسٹن چرچل تھا جو برطانوی تاریخ میں اپنے دلیرانہ اور بروقت فیصلوں کے باعث بڑی شہرت رکھتا تھا۔ چرچل کو ہندوستان میں اٹھنے والی اس بے چینی نے بھی پریشان کئے رکھا تھا۔ اس نے کوشش کی کہ کسی طرح ہندوستان میں امن بحال ہو اور یہ اسی وقت ممکن تھا کہ دونوں بڑی سیاسی جماعتوں کانگریس اور مسلم لیگ میں مفاہمت ہو مگر متعدد کوششوں کے باوجود مشترکہ تعاون کی کوئی نئی راہ نہ نکل سکی اس کی بڑی وجہ کانگریس تھی۔ بالآخر چرچل نے برطانوی وزراء کی ایک کمیٹی بنائی جس کا نام "انڈیا کمیٹی" رکھا گیا یہ مسٹر ایٹلی کی قیادت میں بنائی گئی جو کہ ہندوستان کے حالات کیلئے حکومت کو تجویز پیش کرے۔ اس کمیٹی نے یہ تجویز پیش کی کہ ایک مشن بھیجا جائے جو ہندوستان کی سیاسی جماعتوں کو کسی ایک حل پر متفق کر سکے۔ مسٹر چرچل نے ایٹلی کی یہ تجویز منظور کی اور 11 مارچ 1942ء کو مسٹر اسٹیفورڈ کرپس کی سربراہی میں ایک وفد ہندوستان پہنچے تا کہ اپنا کام شروع کر سکیں۔

کرپس مشن اور تجاویز: مسٹر اسٹیفورڈ کرپس نے ہندوستان آ کر حکومت اور سیاسی جماعتوں کے ساتھ مذاکرات شروع کئے۔ ان مذاکرات میں تمام سیاسی جماعتوں کے اہم سیاستدانوں نے حصہ لیا۔ 29 مارچ 1942ء کو مسٹر کرپس نے ان ملاقاتوں کے بارے میں اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے ایک اخباری کانفرنس میں بتایا کہ:

۱۔ آئین ساز اسمبلی مکمل اعلان آزادی کے ساتھ شروع ہو سکتی ہے۔

۲۔ آئے ساز اسمبلی کو مکمل آزادی ہوگی کہ چاہے برطانیہ کے ساتھ ضم ہو یا نہ ہو۔

۳۔ یہ اسمبلی برطانوی گورنر کو قبول کرنے یا نہ کرنے کی مجاز ہوگی۔

۴۔ ہندوستان کی ریاستوں کو آئین ساز اسمبلی میں شرکت پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔

۵۔ جنگ کے دوران قائم ہونے والی حکومت کو محکمہ دفاع کا محکمہ نہیں دیا جا سکتا۔ کیونکہ اس کا تعلق بین الاقوامی امور سے ہے۔

۶۔ عبوری حکومت میں وائسرائے کی ایگزیکٹیو کونسل کے ارکان کو ہی کابینہ تصور کیا جائیگا۔

۷۔ ان تجاویز کو یا تو پوری طرح بروئے کار لایا جائے گا یا مکمل طور پر مسترد کر دیا جائیگا۔

اس بیان کی روشنی اور وضاحت کیلئے ہندوستان میں ایک نئے وفاق کے قیام کے لئے جو تجاویز رکھیں۔ وہ مندرجہ ذیل تھیں۔ اس کا اعلان بھی 29 مارچ 1942ء کو کیا گیا۔

۱۔ جنگ کے خاتمے کے ساتھ ہی ہندوستان کا دستور بنانے کیلئے ایک مجلس منتخب بنائی جائیگی جس میں ہندوستان کی ریاستوں کے نمائندے بھی شامل ہونگے اس طرح متفقہ آئین مرتب کیا جائیگا اس کی وضاحت میں کہا گیا۔ کہ اگر ہندوستان کا کوئی صوبہ نیا دستور منظور کرنے کیلئے تیار نہ ہو تو وہ اپنی موجودہ آئینی حیثیت قائم رکھ سکتا ہے چاہے تو بعد میں نئے دستور میں شامل ہو سکتا ہے اور اگر وہ الحاق نہ کرنا چاہیں تو وہ اپنے آئین کے ساتھ اپنا مرتبہ علیحدہ رکھ سکتا ہے اور اس کی حیثیت انڈین یونین کی ہوگی۔

۲۔ جنگ کے خاتمے کے بعد حکومت اور ہندوستان کی سیاسی جماعتوں کے نمائندے ایک معاہدہ پر دستخط کریں گے اور دستور کی آخری شکل گفت وشنید سے دی جائیگی اس میں نسلی اور مذہبی اقلیتوں کے تحفظ کا واضح انتظام ہوگا اور برطانوی دولت مشترکہ سے تعلقات رکھنے یا نہ رکھنے پر کوئی پابندی نہ ہوگی۔

۳۔ جنگ کے بعد صوبوں کے انتخابات ایوان زیریں کے ارکان متناسب نمائندگی کے تحت ایک انتخابی ادارہ قائم کریں گے۔ یہ ادارہ انتخابی ادارے کا 1/10 کے برابر ہوگا۔

۴۔ جنگ کے دوران اور نئے دستور کے بننے تک برطانوی حکومت ہی ہندوستان کے دفاع کی ذمہ دار ہوگی۔ ہندوستان کی فوجی، اخلاقی اور مادی تنظیم کے کام میں حکومت ہندوستانیوں کے تعاون سے کام کرے گی۔

اس طرح کرپس مشن میں نئے آئین کے نفاذ تک ہندوستان میں موجودہ حکومت ہی کام کرے گی۔ اس طرح برطانوی حکومت کو ہندوستان پر قبضے کو مزید طوالت کی سبیل پیدا ہو جاتی ہے۔ کیونکہ یہ امر ظاہر تھا کہ تمام سیاسی جماعتیں مشکل ہی سے تمام امور پر متفق ہو سکتی ہیں اس طرح برطانوی اقتدار کو طوالت کا موقع مل جاتا تھا۔

ہندوستانیوں کا رد عمل: کرپس مشن میں یہ مشروط کہ یا تو اسے کلی طور پر منظور کیا جائے یا کلی طور پر رد کر دیا جائے۔ یہ تجاویز کانگریس اور مسلم لیگ دونوں کیلئے قابل قبول نہیں۔ کانگریسی اور مسلم لیگی دونوں لیڈروں نے اس پر اس طرح تبصرہ کیا مسٹر گاندھی نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا:

"یہ وہ چیک ہے جو جنگ کے بعد کیش ہو سکے گا"

قائداعظم نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ:

"ان تجاویز سے جو انتخابات کرانے مقصود ہونگے وہ تو سراسر کانگریس کو تکمتری صد بلا چوں چراں دے دینے کے مترادف ہوگا اور مسلمانوں کو کبھی اکثریت کے سامنے نہ بن پڑے گی۔"

ہندو مہاسبھا کا خیال تھا کہ ان تجاویز میں صوبوں کو یہ اختیار دے دیا گیا کہ وہ انڈین یونین سے الگ رہنے کا فیصلہ کر سکتے ہیں۔ اس سے تو ہندوستان کی وحدت کسی بھی وقت ٹوٹ سکتی ہے۔ اس طرح کرپس مشن تجاویز مکمل طور پر کسی بھی جماعت کیلئے قابل قبول نہ تھی۔ کانگریس جلد از جلد اقتدار کی منتقلی چاہتی تھی جبکہ مسلم لیگ اپنے مطالبات کے بارے میں واضح فیصلے کی خواہشمند تھی اور مہاسبھا کسی بھی صورت میں ہندوستان کو ٹکڑوں میں تقسیم ہوتے ہوئے نہ دیکھ سکتی تھی وہ اکھنڈ بھارت کا تصور رکھتی تھی تقریباً یہی سوچ کانگریس کی تھی۔

کیبنٹ مشن 1946

مارچ 1946ء میں برطانوی کیبنٹ کا ایک سہ رکنی وفد جس کی قیادت ہندوستان کے سیکریٹری آف اسٹیٹ لارڈ پیتھک لارنس کر رہے تھے اور سر اسٹیفورڈ کرپس اور اے وی الیگزینڈر اراکین کی حیثیت سے ان کے ہمراہ تھے نئی دہلی آیا تاکہ ہندوستان کا تعطل میں پڑا ہوا سیاسی و آئینی مسئلہ حل کیا جا سکے۔

مقاصد:

۱۔ ہندوستانی رہنماؤں اور منتخب نمائندوں سے صلاح مشورہ کر کے نیا دستور مرتب کرنے کے لئے قابلِ قبول لائحہ عمل کی تیاری

۲۔ نیا دستور بنانے کے لئے دستور ساز ادارے کا قیام اور

۳۔ ایک ایسی انتظامی کونسل کی تشکیل جو تمام سیاسی پارٹیوں کے لئے قابلِ قبول ہو۔

تجاویز:

۱۔ برطانوی ہند اور ریاستوں پر مشتمل ایک مرکزی حکومت قائم کی جائے جس کے پاس امور خارجہ، دفاع اور مواصلات کے شعبے ہوں ان محکموں کی مالی ضروریات پوری کرنے کے لئے مرکزی حکومت کو مناسب اقدامات کا حق حاصل ہو۔

۲۔ مرکز میں ایک انتظامی کونسل اور مجلس قانون ساز کی تشکیل دی جائیں جن میں برطانوی ہند اور ریاستوں کے نمائندے شامل ہوں کسی اہم فرقہ ورانہ مسئلے پر فیصلے کیلئے ایوان کے ممبروں کی اکثریت کی موجودگی اور دو بڑے فرقوں کی کثرت رائے ضروری ہے۔

۳۔ مرکزی حکومت کے متذکرہ شعبوں اور مالیتی اختیارات کے علاوہ باقی تمام اختیارات صوبوں کے پاس ہوں۔ اسی طرح ریاستوں کے پاس بھی تمام اختیارات ہوں ماسوائے ان امور کے جو مرکز کے حوالے کئے گئے ہوں۔

۴۔ صوبوں کو گروپ سازی کی آزادی ہو جن کی اپنی عاملہ اور دستور ساز اسمبلیاں ہوں۔

۵۔ ہر گروپ کی انتظامیہ اپنے صوبوں کے ساتھ مشترکہ صوبائی امور کا تعین کرنے کی مجاز ہو۔

۶۔ مرکزی اور صوبائی دساتیر میں یہ شق شامل ہو کہ کوئی بھی صوبائی اسمبلی ابتدائی دس سال اور بعد ازاں ہر دس سال کے بعد کثرت رائے سے دستور کے مندرجات پر نظر ثانی کرنے کا فیصلہ کر سکے۔

مذکورہ بالا تجاویز کے لحاظ سے صوبوں کی گروپ بندی کرنے کا یہ طریقہ کار متعین ہوا۔

گروپ اے: مدراس، بمبئی، یو پی، سی پی، بہار اور اڑیسہ (ہندو اکثریتی گروپ)

گروپ بی: پنجاب، صوبہ سرحد اور سندھ (مغربی مسلم اکثریتی گروپ)

گروپ سی: بنگال اور آسام (مشرقی مسلم اکثریتی گروپ)

لیکچرار: شیخ آصف اقبال ظہوری

3 جون کا منصوبہ (1947)ء

مارچ 1947ء میں لارڈ ویول کو واپس بلا لیا گیا اور اس کی جگہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو ہندوستان کا وائسرائے مقرر کیا گیا۔ اس کے تقرر کو کانگریس نے زبردست خوش آمدید کہا کیوں کہ ماؤنٹ بیٹن سے کانگریس کے بڑے اچھے تعلقات تھے۔ ہندوستانی لیڈروں سے کئی کانفرنسوں کے بعد ماؤنٹ بیٹن لندن گئے اور برطانوی حکومت سے ایک متبادل منصوبہ پر مشورہ کر کے 2 جون 1947ء کو واپس آ گئے اور ہندوستانی لیڈروں سے ملاقات کی اور 3 جون کو ایک نئے منصوبے کا اعلان کیا۔ اپنی نشری تقریر میں انہوں نے کہا کہ انہیں بڑا افسوس ہے کہ ہندوستان کو متحد رکھنے کا کوئی منصوبہ ملک کی سیاسی جماعتوں کے لئے قابل قبول نہیں ہے۔ لہٰذا اس کا واحد حل صرف یہ ہے کہ برطانوی اقتدار کو دو حکومتوں کے سپرد کر دیا جائے جس سے ہر ایک کو ڈومینین کی حیثیت حاصل ہو اور اقتدار کی یہ منتقلی آئندہ چند مہینوں میں عمل میں آئے گی۔

خصوصیات:

۱۔ برصغیر کے وہ سارے علاقے جن کی موجودہ قانون ساز اسمبلی میں نمائندگی نہ ہو انہیں یہ فیصلہ کرنا چاہئے کہ آیا ان کا آئین موجودہ قانون ساز اسمبلی تیار کرے گی یا نئی قانون ساز اسمبلی یہ کام کرے گی۔

۲۔ بنگال اور پنجاب کی قانون ساز اسمبلی کو دو حصوں میں ایک مسلم اکثریتی علاقہ کی نمائندہ اور دوسرے ہندو صوبہ کی نمائندہ کو آپس میں ملاقات کرنا چاہئے اور ہر حصہ کو اکثریتی ووٹ کے ذریعہ یہ فیصلہ کرنا چاہئے کہ ان صوبوں کی تقسیم ہونا چاہئے یا نہیں۔ اگر ان میں سے کوئی ایک تقسیم کے حق میں فیصلہ کرے تو اس پر اسی طرح عمل کرنا چاہئے۔ اس سلسلہ میں اضلاع کی آبادی کے تعین کے لئے 1941ء کی مردم شماری کو مستند سمجھا جائے گا۔

۳۔ سندھ کی قانون ساز اسمبلی کی صوابدید پر یہ بات منحصر ہوگی کہ وہ چاہے تو موجودہ قانون ساز اسمبلی میں شرکت کرے یا نئی قانون ساز اسمبلی میں شرکت کرے۔

۴۔ شمال مغربی صوبہ سرحد کے عوام استصواب رائے کے ذریعے اس بات کے لئے ووٹ دیں گے کہ وہ کس قانون ساز اسمبلی میں شرکت کرنا چاہتے ہیں۔

۵۔ آسام کے ضلع سلہٹ میں بھی وہی طریقہ کار اختیار کیا جائے جو صوبہ سرحد میں اختیار کیا گیا ہو۔

۶۔ بنگال، پنجاب اور سلہٹ اگر نئی قانون ساز اسمبلی کے حق میں فیصلہ دیں تو ان مسلم اکثریتی علاقوں کی سرحدوں کے تعین کے لئے ایک باؤنڈری کمیشن مقرر کیا جائے۔

۷۔ اگر بنگال، پنجاب اور سلہٹ نئی قانون ساز اسمبلی میں شراکت کے حق میں فیصلہ دیں تو پھر ایک ملین آبادی کے لئے ایک نمائندہ کے اصول پر ان علاقوں میں نئے سرے سے انتخابات کرائے جائیں۔

۸۔ قبائلی علاقوں کے بارے میں معاہدہ کرنے کے لئے آئندہ بننے والی اتھارٹی سے گفت و شنید کی جائے گی۔

۹۔ ہندوستانی ریاستوں کی حیثیت میں کوئی تبدیلی نہیں ہوگی۔

۱۰۔ مجالس قانون ساز کو یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ چاہیں تو برطانوی دولت مشترکہ میں شامل رہیں یا اگر پسند کریں تو مکمل طور پر آزاد ہو جائیں۔

قانون آزادی ہند 1947ء

اس مسودہ قانون کو برطانوی وزیر اعظم اٹیلی نے خود 4 جولائی کو دارالعوام میں پیش کیا۔ 15 جولائی کو دارالعوام نے اور 16 جولائی کو دارالامراء نے اس کو منظور کر لیا۔ اس میں کوئی ترمیم نہیں کی گئی۔ 18 جولائی کو اسے شاہی منظوری حاصل ہو گئی اور گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1935ء کے پاس ہونے کے تقریباً 12 سال بعد یہ آزادی ہند کا ایکٹ منظور ہو گیا جس کے ذریعہ تقسیم ہند کا فیصلہ ہوا اور ہندوستان کی دو ڈومینین یعنی پاکستان اور ہندوستان وجود میں آئیں (جس کے لئے 15 اگست 1947ء کی تاریخ مقرر ہوئی)۔

خصوصیات:

۱۔ دونوں ڈومینین میں قانون سازی کی بالادستی۔

۲۔ دونوں ڈومینین کی قانون ساز اسمبلیوں کی اس بات کے مکمل اختیارات دئے گئے کہ وہ اپنے حلقہ اختیار والے علاقے کے لئے

قانون سازی کریں۔

۳۔ برطانوی حکومت کو ڈومینین کے معاملات پر 15 اگست 1947ء کے بعد کوئی بالادستی حاصل نہ ہوگی اور نہ صوبوں پر یا ڈومینین کے کسی حصہ پر۔

۴۔ جب تک ہر ڈومینین کے لئے کوئی نیا آئین بنایا جاتا تب تک وہ موجودہ دستور ساز اسمبلیوں اور ڈومینین کی قانون ساز اسمبلیوں کے تابع رہیں گی تمام اسمبلیاں وہ سارے اختیارات استعمال کریں گی جو گزشتہ دور میں مرکزی قانون ساز اسمبلی استعمال کرتی تھی اس کے علاوہ اسے اختیار ہوگا کہ وہ ایک نیا آئین بنا لے۔

۵۔ نئے آئین کے بننے تک ہر ایک ڈومینین اور تمام صوبوں پر حکومت ہند کے ایکٹ 1935ء کے تحت حکومت کی جائے گی۔ ہر ڈومینین کو اختیار ہوگا کہ وہ (اپنی ضرورت کے تحت) اس ایکٹ میں قانون آزادی ہند 1947ء کی روشنی میں ترامیم کرے۔

۶۔ گورنر جنرل کو یہ اختیار ہوگا کہ وہ اگر ضروری سمجھے تو 31 مارچ 1948ء تک حکومت ہند کے ایکٹ 1935ء میں تبدیلی یا ترامیم کرے اس تاریخ کے بعد قانون ساز اسمبلی کو یہ اختیار ہوگا کہ حکومت ہند کے ایکٹ 1935ء میں ترمیم کرے یا اس ایکٹ کو اپنا لے۔

۷۔ تاج برطانوی کا قوانین کے بارے میں حق تنسیخ (ویٹو) جو شاہ کی خوشنودی کے لئے ہوتا تھا وہ منسوخ ہو گیا اور اب یہ حق گورنر جنرل استعمال کر سکے گا۔ اسے یہ اختیار دیا گیا ہے کہ وہ بادشاہ کے نام سے ڈومینین کے لئے کوئی قانون ڈومینین کی قانون ساز اسمبلی میں عمومی قانون سازی کے اصول پر وضع کر لے۔

۸۔ ایکٹ کے ذریعہ تاج برطانیہ کی ہندوستانی ریاستوں پر بالادستی اور تسلط کا خاتمہ کر دیا گیا۔ سارے معاہدے، راضی نامے اور افعال جو شاہ برطانیہ کی نسبت سے تھے جن کا تعلق ریاستوں سے تھا یا ان کے حکمرانوں سے متعلق تھا وہ سب 15 اگست 1947ء سے منسوخ سمجھے جائیں گے۔

۹۔ صوبہ سرحد کے قبائل سے آئندہ بننے والی ڈومینین معاہدات کرے گی۔

۱۰۔ سیکریٹری آف اسٹیٹ برائے ہند کا عہدہ ختم کر دیا گیا۔

۱۱۔ "شہنشاہ ہند" کے لقب کے بجائے اب تاج برطانیہ "شاہ انگلستان" ہوگا۔

۱۲۔ اس ایکٹ نے برطانوی حکومت کی ہندوستان پر بالادستی اور تسلط کو ختم کر دیا اور اس کے ذریعہ دو ڈومینین بنادی گئیں جن میں سے ہر ایک کو اپنی سوابدید پر آئین سازی کے مکمل اختیارات دے دئے گئے۔ دونوں ڈومینین کو یہ اختیارات تھی دیئے گئے کہ وہ جب چاہیں برطانوی دولت مشترکہ چھوڑ سکتے ہیں۔

نتائج: 20 جولائی کو ہندوستان اور پاکستان کے لئے علیحدہ علیحدہ صوبائی حکومتیں بنادی گئیں۔ 7 اگست کو جناح نے آخری بار ہندوستان چھوڑ دیا اور کراچی ک لئے پرواز کر گئے جو پاکستان ڈومینین کا دارالخلافہ بنا۔ 11 اگست کو پاکستان کی قانون ساز اسمبلی کا اجلاس ہوا اور اس میں جناح صاحب کو صدر منتخب کیا گیا۔ 13 اگست کو ماؤنٹ بیٹن کراچی آئے اور 14 اگست کو قانون ساز اسمبلی سے خطاب کیا۔ 15 اگست 1947ء کو جناح نے گورنر جنرل کے عہدے کا حلف اٹھایا اور نئی پاکستانی کابینہ نے حکومت سنبھال لی۔

قیام پاکستان میں مسلم لیگ کا کردار

مسلم لیگ کا قیام: کانگریس کے قیام، تقسیم بنگال کے خلاف ہندوؤں کے پرتشدد مظاہروں اور شملہ وفد کی کامیابی کے بعد مسلم قائدین نے ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے ایک سیاسی پلیٹ فارم کی ضرورت شدت سے محسوس کرنا شروع کی تاکہ مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کی جاسکے اور شملہ وفد کے مطالبات کو عملی جامہ پہنایا جاسکے، چنانچہ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس کے موقعے پر 30 دسمبر 1906 کو ڈھاکہ میں نواب وقار الملک کی زیر صدارت ایک اجلاس ہوا۔ اس اجلاس میں مسلم لیگ کا قیام عمل میں لایا گیا۔

جداگانہ انتخاب: شملہ وفد کا حکومت سے اہم ترین مطالبہ مسلمانوں کے لئے جداگانہ طریقہ انتخاب تھا۔ مسلم لیگ نے اس مطالبے کو منوانے کے لئے گراں قدر خدمات انجام دیں۔ برصغیر میں اس بات کو ابتداء میں ہی تسلیم کرلیا گیا تھا کہ برطانوی رائے عامہ کو ہموار کئے بغیر مسلمان اپنے حقوق حاصل نہیں کرسکتے۔ چنانچہ اس نظریئے کے تحت 6 مئی 1908ء کو لندن میں سید امیر علی کی زیر صدارت ایک اجلاس ہوا اور مسلم لیگ لندن برانچ کا قیام عمل میان لایا گیا۔ سید امیر علی نے لندن برانچ کے صدر کی حیثیت سے انتہائی قابلِ قدر خدمات انجام دیں۔ انہوں نے ویز ہند جان مارلے کو قائل کیا کہ مسلم تشخص کی بقاء کے لئے جداگانہ انتخاب کا طریقہ رائج کرنا ضروری ہے۔ سید امیر علی کی کوششوں کا ہی نتیجہ تھا کہ منٹو مارلے اصلاحات 1909ء میں مسلمانوں کے اس حق کو تسلیم کرلیا گیا۔

ہندو مسلم اتحاد کی کوششیں: 1910ء کے بعد کچھ ایسے واقعات مثلاً تقسیم بنگال کی تنسیخ، ساحہ مسجد کانپور، علی گڑھ یونیورسٹی کے قیام میں رکاوٹیں اور جنگ طرابلس و بلقان وغیرہ ہوئے جنہوں نے یہ ثابت کردیا کہ انگریز مسلمانوں کے خیر خواہ نہیں ہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ ہندوؤں کے ساتھ باعزت سمجھوتہ کرکے حقوق کی جنگ لڑی جائے۔ محمد علی جناح اس زمانے میں مسلم لیگ اور کانگریس دونوں کے رکن تھے آپ ہندو مسلم اتحاد کے سفیر سمجھے جاتے تھے۔ آپ کی کوششوں سے مسلم لیگ اور کانگریس کے درمیان میثاق لکھنو 1916ء ہوا اس میں کانگریس نے منتخب اداروں میں مسلمانوں کی علیحدہ نمائندگی کا حق تسلیم کیا۔

1920ء کے عشرے میں کئی اہم سیاسی واقعات رونما ہوئے ان میں رولٹ ایکٹ ایجی ٹیشن، جلیانوالہ باغ کا سانحہ تحریک خلافت اور تحریک عدم تعاون قابل ذکر ہیں جن میں مسلمانوں اور ہندوؤں نے ایک دوسرے کے ساتھ مل کر کام کیا۔ لیکن تحریک خلافت میں گاندھی جی کے منافقانہ کردار اور نہرو رپورٹ 1982ء کی وجہ سے مسلمانوں اور ہندوؤں کی راہیں جدا جدا ہوگئیں۔ نہرو رپورٹ میں مسلمانوں کے تمام تحفظات کو نظر انداز کیا گیا جو انہیں میثاق لکھنو میں دیئے گئے تھے۔ نہرو رپورٹ کے ردعمل کے طور پر قائداعظم نے چودہ نکات پیش کئے۔ نہرو رپورٹ کی سفارشات اور قائداعظم کے چودہ نکات کا موازنہ کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان سیاسی خلیج کافی وسیع ہوگئی تھی۔

مسلم ریاست کا تصور: علامہ اقبال نے 29 دسمبر 1930ء کو مسلم لیگ کے 21 ویں سالانہ اجلاس منعقدہ الہ آباد کے موقع پر اپنے صدارتی خطبے میں ہندوستان میں ایک مسلم ریاست کا تصور پیش کیا۔ انہوں نے مسلم ریاست کی علاقائی حدود متعین کرتے ہوئے کہا۔ "میری خواہش ہے کہ پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان کو ایک ہی ریاست میں ملا دیا جائے۔ خواہ یہ ریاست سلطنت برطانیہ کے اندر حکومت خود اختیاری حاصل کرے خواہ اس کے باہر مجھے ایسا نظر آتا ہے کہ شمال مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کو بالآخر ایک منتظم مسلم ریاست قائم کرنی پڑے گی۔" علامہ اقبال کا پختہ یقین تھا کہ مسلمانوں کے سماجی اور معاشی مسائل کا حل اسلامی قوانین پر عمل کرنے میں ہے لیکن متحدہ ہندوستان میں غیر مسلم اکثریت کی وجہ سے ان قوانین کا نفاذ ممکن نہ تھا۔ اس لئے ایک علیحدہ مسلم ریاست کا قیام ناگزیر تھا۔ اس یقین کا اظہار ان کے کئی خطوط میں بھی ہوتا ہے جو انہوں نے 1936ء اور 1937ء کے دوران قائداعظم کو لکھے۔

جدوجہد پاکستان: صوبائی انتخابات 1937ء کے نتیجے میں کانگریس نے 11 میں سے 7 صوبوں میں اپنی وزارتیں قائم کیں۔ کانگریس نے اپنی عددی اکثریت کے گھمنڈ میں کسی بھی صوبائی وزارت میں مسلم لیگ کو شامل نہ کیا اور مسلم دشمنی پر مبنی متعدد اقدامات کئے۔ بندے ماترم جیسے تعصب سے لبریز ہندو گیت کو قومی ترانہ قرار دیا، اردو کو نظر انداز کرکے ہندی کی سرپرستی کی، واردھا اور ودیا مندر کی تعلیمی اسکیموں کے تحت مسلمانوں کے ذہنوں کو مسموم کرنے کی ناپاک سازش کی گئی، کانگریس کے ترنگے جھنڈے کو

ہندوستان کا قومی پرچم بنایا گیا۔ غرض یہ کہ مسلم تشخص کو ختم کرنے کے لئے جتنی صورتیں ہو سکتی تھیں وہ اختیار کی گئیں۔ کانگریس کے اس متعصبانہ رویے کی وجہ سے مسلمانوں کو شدت سے اس بات کا احساس ہوا کہ بحیثیت قوم ان کا متحدہ ہندوستان میں کوئی مستقبل نہیں ہے۔ اس کے بعد مسلم رائے عامہ علیحدہ وطن کے حصول کے لئے تیار ہوئی۔

ستمبر 1939ء میں دوسری عالمی جنگ چھڑ گئی اور مسلم لیگ کو کانگریس کے برابر درجہ مل گیا۔ کانگریس جنگی حکمت عملی پر اختلاف کرتے ہوئے اکتوبر 1939ء میں صوبائی وزارتوں سے استعفیٰ دے دیا۔ مسلم لیگ نے کانگریسی وزارتوں کے استعفیٰ پر 22 دسمبر 1939ء کو یوم نجات منایا اور برطانوی حکومت کی راہ میں کسی قسم کی رکاوٹ نہیں ڈالی۔

مارچ 1941ء میں مسلم لیگ نے اپنے 27 ویں سالانہ اجلاس منعقدہ لاہور میں دوقومی نظریئے کی بنیاد پر تقسیم ہند کی قرارداد منظور کی یہ وہ زمانہ تھا جب دوسری عالمی جنگ کی لپیٹ میں تھی۔ حکومت برطانیہ کی خواہش تھی کہ ہندوستان کی بڑی سیاسی جماعتوں سے سمجھوتہ کر کے ہندوستان کے زیادہ سے زیادہ وسائل کو جنگی مقاصد کے لئے استعمال کیا جائے۔ اس سلسلے میں برطانوی حکومت نے مارچ 1942ء میں کرپس مشن کو ہندوستان بھیجا۔ لیکن ہندوستان کی دونوں بڑی سیاسی جماعتوں مسلم لیگ اور کانگریس نے سمجھوتے کے سلسلے میں کرپس مشن کی تجویز کو بالکل رد کر دیا۔

اگست 1942ء میں کانگریس نے انگریزوں کے خلاف "ہندوستان چھوڑ دو" تحریک شروع کی۔ قائداعظم نے اس کے جواب میں "تقسیم کرو اور چھوڑ دو" کا نعرہ لگایا۔ اس کے مطلب یہ تھا کہ مسلمان صرف برطانیہ سے ہی آزادی نہیں چاہتے بلکہ ہندو اکثریت کے تسلط سے بھی نجات چاہتے ہیں۔

قائداعظم کے مطالبے پر 1935ء کے ایکٹ کے تحت 46-1945ء میں عام انتخابات ہوئے۔ مسلم لیگ نے پاکستان کے نام پر انتخابات میں حصہ لیا۔ مرکزی اسمبلی میں مسلمانوں کی کل 30 نشستیں تھیں۔ مسلم لیگ نے نشست پر کامیابی حاصل کی۔ اس کے مقابلے میں کانگریسی مسلمانوں کو ہر جگہ ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ صوبائی انتخابات میں بھی مسلم لیگ نے 86.6 فیصد مسلم نشستیں حاصل کیں۔ مسلم لیگ کی شاندار کامیابی نے یہ ثابت کر دیا کہ صرف مسلم لیگ ہی مسلمانوں کی حقیقی نمائندہ جماعت ہے اور مسلمانوں کی منزل پاکستان ہے۔ اس کے لئے برطانوی حکومت کے لئے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ مستقبل کا لائحہ عمل لیگ کی رضامندی کے بغیر مرتب کرتی۔

کیبنٹ مشن کی ناکامی کے بعد 16 اگست 1946ء کو مسلم لیگ نے "یوم راست اقدام" منایا۔ اس دن مسلمانوں نے ملک بھر میں جلسے منعقد کئے اور جلوس نکالے۔ وائسرائے اور کانگریس کے ہتھکنڈوں کے خلاف احتجاج کیا۔ یہ دن پورے ملک میں امن کے ساتھ گزر گیا۔ لیکن کلکتہ میں شدید فرقہ وارانہ فسادات کی آگ بھڑک اٹھی جس نے دیکھتے ہی دیکھتے پورے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ ان فسادات کا واحد حل ملک کی تقسیم تھا۔ چنانچہ 3 جون منصوبہ اور قانون آزادی ہند کے تحت ہندوستان کی تقسیم اور آزادی کا اعلان ہوا اور 14 اگست 1947ء کو پاکستان ایک اسلامی ملک کی حیثیت سے دنیا کے نقشے پر ابھرا۔ تحریک پاکستان میں مسلم لیگ نے جو کردار ادا کیا ہے وہ کوئی دوسری سیاسی جماعت ادا نہیں کر سکی۔

☆

تحریک پاکستان میں صوبوں کا کردار

تحریک پاکستان میں سندھ کے کردار: سندھ میں مسلمان تحریک پاکستان کے لئے روح رواں کا مرتبہ رکھتے ہیں جب 1906ء میں متحدہ ہندوستان کے مسلمانوں نے اپنی سیاسی جماعت "مسلم لیگ" قائم کی تو سندھ کے مسلمانوں نے اس کے پیغام پر لبیک کہا اور مسلم لیگ کا دوسرا اجلاس 30 دسمبر 1907ء کو سندھ کے مشہور شہر کراچی میں منعقد ہوا۔ اور 1917ء میں مسلم لیگ کی باقاعدہ صوبائی شاخ بھی سندھ میں قائم ہو گئی مسلم لیگ کی اس باقاعدہ شاخ کے قیام میں سندھ کے ممتاز اور پرخلوص رہنما غلام محمد بھرگڑی کا ہاتھ تھا۔

سندھ کے سیاسی رہنماؤں اور عوام نے مسلمانوں کی ہر تحریک میں نمایاں حصہ لیا جب 1920ء میں ترکوں کی حمایت شروع ہوئی تو سندھ کے عوام نے نہ صرف اس میں حصہ لیا بلکہ اسے کامیاب بنانے دامے درمے اور سخنے کے انداز میں اس کی مدد کی اور خلافت کانفرنس کے اجلاس بھی سندھ کے مشہور شہروں میں منعقد کرائے جب میں کراچی اور لاڑکانہ کے اجلاس بہت مشہور ہیں۔ ان جلسوں کے انعقاد میں غلام محمد بھرگڑی اور حاجی عبداللہ ہارون کا بہت بڑا حصہ ہے جب 1921ء میں مولانا محمد علی جوہر کی قیادت اور

[illegible]

1930ء میں الہ آباد میں ... مسلم لیگ کا اجلاس ... [illegible]

1938ء میں کراچی میں سندھ مسلم لیگ کا اجلاس ہوا۔ اس اجلاس میں سندھ مسلم لیگ کے ارکان نے ... اور اعلان کیا گیا کہ مسلم ہندوستان اور غیر مسلم ہندوستان کی تقسیم کر دی جائے۔ ہندوستان کے تمام مسلمانوں نے اس ... سندھ اسمبلی کے اس فیصلہ کو تمام مسلمانوں کا فیصلہ قرار دیا۔ اسی سال جب سندھ میں مسلم لیگ کے ... منتخب ہوئے۔

1940ء میں قرارداد پاکستان مسلم لیگ کے (سالانہ) اجلاس لاہور میں منظور ہوئی تو سندھ کے مسلمانوں نے اس کی پرزور حمایت کی۔ اس قرارداد کی منظوری سے ہندوؤں اور انگریزوں کے سینوں پر سانپ لوٹنے لگے ہندوؤں نے اس کے خلاف مظاہرے شروع کر دیے اس موقع پر سندھ کے مسلمانوں نے ہندوؤں کی مکاریوں کا نہایت جرات مندی سے مقابلہ کیا اور تحریک پاکستان میں رکاوٹ ڈالنے والوں سے ٹکر لی۔ اور قوم کی رہنمائی کا بوجھ اپنے کندھوں پر رکھا۔

قیام پاکستان (جدوجہد آزادی) میں صوبہ پنجاب کا کردار: پنجاب آبادی اور وسائل کے لحاظ سے بہت بڑا صوبہ تھا مگر انگریزوں اور ہندوؤں کی سازش کی وجہ سے یہاں کے مسلمان استحصال کا شکار تھے۔ اس صوبہ کو خواب غفلت سے بیدار کرنے کے لئے ڈاکٹر اقبال مولانا ظفر علی خان، مولانا مرتضیٰ احمد، مولانا غلام رسول مہر اور مولانا عبدالمجید سالک نے بہت کام کیا۔ عظیم مفکر علامہ اقبال نے اپنے اشعار و افکار سے برصغیر کے مسلمانوں کو جھنجھوڑا۔ مولانا ظفر علی خان نے 1912ء میں زمیندار اخبار جاری کیا جو ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے بالعموم اور پنجاب کے مسلمانوں کے لئے بالخصوص ایک عظیم ترجمان تھا۔ اس اخبار کے ذریعے مولانا ظفر علی خان نے پنجاب کے مسلمانوں میں سیاسی بیداری پیدا کر کے انہیں مسلم لیگ کا ہمنوا بنا دیا۔ اور انہوں نے مسلمانوں کے مطالبہ پاکستان کے مخالفین پر تابڑ توڑ حملے کئے اور اس طرح پنجاب میں تحریک پاکستان کا راستہ ہموار کر دیا۔ 1934ء میں لاہور سے روزنامہ "احسان" جاری ہوا۔ اس روزنامہ کے مدیر اعلیٰ مولانا مرتضیٰ احمد تھے۔ انہوں نے اس روزنامہ کو مسلمانوں میں سیاسی بیداری کرنے کے لئے وقف کر دیا تھا۔ وہ قدم قدم پر مسلمانوں کی تائید و حمایت کرتے رہے۔ مولانا غلام رسول مہر اور مولانا عبدالمجید سالک نے پنجاب کے مسلمانوں میں سیاسی روح پھونک دی انہوں نے اپنی تقریروں اور تحریروں کے ذریعہ مسلمانوں میں جہاد کا ایسا جذبہ پیدا کر دیا کہ پنجاب میں مسلمان انگریزوں اور ہندوؤں کے راستے میں سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن گئے اور انہیں آزادی کی جدوجہد سے کوئی طاقت نہ روک سکی۔ ہمارے ان روشن ضمیر رہنماؤں اور قائدین نے تعمیر پاکستان کی عظیم تر جدوجہد میں پنجاب کے مسلمانوں کو پوری طرح شامل کر دیا۔ پنجاب نے آزادی کی جدوجہد میں جو کردار ادا کیا اسے مندرجہ ذیل عنوانات کے تحت واضح کیا جا سکتا ہے

جدوجہد آزادی میں بلوچستان کا کردار: بلوچستان نے قیام پاکستان کے سلسلے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ بلوچستان کے لوگ ہمیشہ اسلام کے شیدائی رہے ہیں۔ وہ غلامی کی زندگی پر موت کو ترجیح دیتے ہیں۔ انہیں انگریزوں اور ہندوؤں سے سخت نفرت تھی۔ وہ اکثر ان قوموں سے برسر پیکار رہتے تھے اس لئے وہ آزادی کے حصول میں پیش پیش رہے۔ بلوچستان نے آزادی کے حصول کے لئے جو کردار ادا کیا اسے مندرجہ ذیل عنوانات کے تحت واضح کیا جا سکتا ہے۔

ا۔ بلوچستان میں مسلم لیگ کا قیام: جون 1939ء میں صوبہ بلوچستان میں مسلم لیگ قائم ہوئی۔ ڈاکٹر غلام نبی اور قاضی محمد عیسیٰ نے اس سلسلے میں نمایاں خدمات انجام دیں اور دیکھتے ہی دیکھتے بلوچ عوام کو مسلم لیگ کے جھنڈے تلے جمع کر دیا۔ اس طرح بلوچستان میں حصول آزادی کے لئے راستہ ہموار ہو گیا۔

صدارت میں آل انڈیا کانفرنس کا اجلاس کراچی میں ہوا تو اس میں سندھ کے ہزاروں لوگوں نے بڑی تعداد میں شرکت کی اور ان میں سے علی برادران کے ساتھ پیر غلام مجدد سرہندی بھی گرفتار ہوئے اور جیل کی سختیاں برداشت کرتے رہے۔

سندھ میں تحریک خلافت کو کامیاب بنانے میں حاجی عبداللہ ہارون اور عبدالمجید سندھی پیش پیش تھے۔ ان حضرات نے تحریک خلافت کو پھیلانے اور اس میں جان ڈالنے کے لئے ایک اخبار "الوحید" جاری کیا اور سندھ میں جن نام نہاد پیروں اور زمینداروں نے تحریک خلافت کے راستے میں روڑے اٹکانے کی کوشش کی ان کا مقابلہ کیا۔ اس موقع پر انگریزوں نے سندھ کے مسلمانوں کو ڈرانے اور دھمکانے کی پوری کوشش کی مگر سندھ کے سپوتوں نے کسی کی پرواہ نہ کی۔ اسلام کے یہ شیدائی اپنے مقاصد کے حصول کے لئے ہر مشکل برداشت کرتے رہے۔

اکتوبر 1930ء میں سندھ صوبائی مسلم لیگ کانفرنس میں ایک قرارداد میں پاکستان کا مطالبہ کیا گیا کہ جن صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے ان میں مسلم حکومت قائم کر دی جائے تاکہ دونوں قومیں الگ الگ حکومتیں بنا سکیں۔

1938ء میں کراچی میں سندھ مسلم لیگ کا اجلاس ہوا۔ اس اجلاس میں سندھ مسلم لیگ کے ارکان نے علیحدہ وطن کا تصور پیش کیا اور اعلان کیا گیا کہ مسلم ہندوستان اور غیر مسلم ہندوستان کی تقسیم کر دی جائے، ہندوستان کے تمام مسلمانوں نے اس حل کو پسند کیا اور سندھ اسمبلی کے اس فیصلہ کو تمام مسلمانوں کا فیصلہ قرار دیا۔ اسی سال جب سندھ میں مسلم لیگ کے صدر منتخب ہوئے۔

1940ء میں قرارداد پاکستان مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس لاہور میں منظور ہوئی تو سندھ کے مسلمانوں نے اس کی پرزور حمایت وتائید کی۔ اس قرارداد کی منظوری سے ہندوؤں اور انگریزوں کے سینوں پر سانپ لوٹنے لگے ہندوؤں نے اس کے خلاف مظاہرے شروع کر دیئے اس موقع پر سندھ کے مسلمانوں نے ہندوؤں کی مکاریوں کا نہایت جرات مندی سے مقابلہ کیا اور تحریک پاکستان میں رکاوٹ ڈالنے والوں سے ٹکر لی۔ اور قوم کی رہنمائی کا بوجھ اپنے کندھوں پر رکھا۔

قیام پاکستان (جدوجہد آزادی) میں صوبہ پنجاب کا کردار: پنجاب آبادی اور وسائل کے لحاظ سے بہت بڑا صوبہ تھا مگر انگریزوں اور ہندوؤں کی شازش کی وجہ سے یہاں کے مسلمان استحصال کا شکار تھے۔ اس صوبہ کو خواب غفلت سے بیدار کرنے کے لئے ڈاکٹر اقبال مولانا ظفر علی خان، مولانا مرتضی احمد، مولانا غلام رسول مہر اور مولانا عبدالمجید سالک نے بہت کام کیا۔ عظیم مفکر علامہ اقبال نے اپنے اشعار وافکار سے برصغیر کے مسلمانوں کو جھنجھوڑا۔ مولانا ظفر علی خان نے 1912ء میں زمیندار اخبار جاری کیا جو ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے بالعموم اور پنجاب کے مسلمانوں کے لئے بالخصوص ایک عظیم ترجمان تھا۔ اس اخبار کے ذریعے مولانا ظفر علی خان نے پنجاب کے مسلمانوں میں سیاسی بیداری پیدا کر کے انہیں مسلم لیگ کا ہم نوا بنا دیا۔ اور انہوں نے مسلمانوں کے مطالبہ پاکستان کے مخالفین پر تابڑ توڑ حملے کئے اور اس طرح پنجاب میں تحریک پاکستان کا راستہ ہموار کر دیا۔ 1934ء میں لاہور سے روزنامہ "احسان" جاری ہوا۔ اس روزنامہ کے مدیر اعلیٰ مولانا مرتضی احمد تھے۔ انہوں نے اس روزنامہ کو مسلمانوں میں سیاسی بیداری کرنے کے لئے وقف کر دیا تھا۔ وہ قدم قدم پر مسلمانوں کی تائید وحمایت کرتے رہے۔ مولانا غلام رسول مہر اور مولانا عبدالحمید سالک نے پنجاب کے مسلمانوں میں سیاسی روح پھونک دی انہوں نے اپنی تقریروں اور تحریروں کے ذریعہ مسلمانوں میں جہاد کا ایسا جذبہ پیدا کر دیا کہ پنجاب میں مسلمان انگریزوں اور ہندوؤں کے راستے میں سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن گئے اور انہیں آزادی کی جدوجہد سے کوئی طاقت نہ روک سکی۔ ہمارے ان روشن ضمیر رہنماؤں اور قائدین نے تعمیر پاکستان کی عظیم تر جدوجہد میں پنجاب کے مسلمانوں کو پوری طرح شامل کر دیا۔ پنجاب نے آزادی کی جدوجہد میں جو کردار ادا کیا اسے مندرجہ ذیل عنوانات کے تحت واضح کیا جاسکتا ہے

جدوجہد آزادی میں بلوچستان کا کردار: بلوچستان نے قیام پاکستان کے سلسلے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ بلوچستان کے لوگ ہمیشہ اسلام کے شیدائی رہے ہیں۔ وہ غلامی کی زندگی پر موت کو ترجیح دیتے ہیں۔ انہیں انگریزوں اور ہندوؤں سے سخت نفرت تھی۔ وہ اکثر ان قوموں سے برسر پیکار رہتے تھے اس لئے وہ آزادی کے حصول میں پیش پیش رہے۔ بلوچستان نے آزادی کے حصول کے لئے جو کردار ادا کیا اسے مندرجہ ذیل عنوانات کے تحت واضح کیا جاسکتا ہے۔

ا۔ بلوچستان میں مسلم لیگ کا قیام: جون 1939ء میں صوبہ بلوچستان میں مسلم لیگ قائم ہوئی۔ ڈاکٹر غلام نبی اور قاضی محمد عیسیٰ نے اس سلسلے میں نمایاں خدمات انجام دیں اور دیکھتے ہی دیکھتے بلوچ عوام کو مسلم لیگ کے جھنڈے تلے جمع کر دیا۔ اس طرح بلوچستان میں حصول آزادی کے لئے راستہ ہموار ہوگیا۔

۲۔قرارداد پاکستان کی حمایت: 23 مارچ 1940ء کو لاہور میں قرارداد پاکستان منظور کی گئی۔ بلوچستان کی طرف سے اس قرارداد کے اجلاس میں قاضی محمد عیسیٰ اور دوسرے عمائدین شریک ہوئے اور اس قرارداد کی مکمل حمایت کا اعلان کیا

۳۔مسلمانان بلوچستان کی استدعا: اپریل 1940ء میں مسلم لیگ کے سیکرٹری نشرواشاعت جناب ڈاکٹر غلام نبی نے ایک اعلان جاری کیا "ہم جملہ مسلمانان ہند سے استدعا کرتے ہیں کہ وہ اس دور افتادہ اور پس ماندہ صوبے کو بھی پوری توجہ اور امداد کا مستحق سمجھیں اور اس پر توجہ دیں" اس اعلان سے اس بات کی غمازی ہوتی ہے کہ بلوچستان کے مسلمانوں میں آزادی کی تڑپ پوری طرح موجزن تھی۔

۴۔شاندار جلوس: 26 جولائی 1940ء کو بلوچستان مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس منعقد ہوا۔ اجلاس کے موقع پر قائدین مسلم لیگ نے کوئٹہ ریلوے اسٹیشن سے ایک شاندار جلوس نکالا اس جلوس میں ہزاروں مسلمانان بلوچستان نے شرکت کی اور آزادی کے حق میں نعرے لگائے۔

۵۔یوم تشکر: 23 مارچ 1941ء کو بلوچستان کے عوام نے کوئٹہ میں ایک عظیم الشان جلسہ منعقد کیا جس میں دستور ساز اسمبلی کے انتخابات میں کانگریسی امیدوار کی شکست پر یوم تشکر منایا گیا جو اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ بلوچستان کے عوام کو مطالبہ پاکستان سے گہری وابستگی تھی۔

۶۔مطالبہ آزادی: 13 مئی 1941ء کو بلوچستان مسلم لیگ کا ایک جلسہ منعقد ہوا۔ جس میں بلوچستان مسلم لیگ کے صدر جناب قاضی محمد عیسیٰ نے آزادی کا مطالبہ پیش کیا اور کہا کہ مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ آزادی کے حصول کے لئے اپنی کوششیں تیز کر دیں اور آزادی کو اپنے نصب العین بنالیں۔

۷۔مسلم لیگ کمیٹی کا قیام: 12 اپریل 1942ء کو مسلم لیگ نے ایک کمیٹی قائم کی جس کا نام مسلم لیگ کمیٹی رکھا گیا۔ اس کمیٹی کا مقصد مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ کرنا تھا۔ اس کمیٹی کے صدر نواب محمد اسماعیل خان تھے اور بلوچستان کی طرف سے اس کمیٹی میں قاضی محمد عیسیٰ شامل تھے۔ بلوچستان کے عوام نے قاضی صاحب کی رہنمائی میں مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ میں نمایاں خدمات انجام دیں۔

۸۔معمار پاکستان کو خوش آمدید: 26 جون 1943ء کو قائداعظم بلوچستان کی سیاسی صورت حال کا جائزہ لینے کے لئے کوئٹہ پہنچے تو اس موقع پر مسلمانوں بلوچستان نے قائداعظم کا پرجوش استقبال کیا اور کہا "ہم معمار پاکستان کو خوش آمدید کہتے ہیں" اس یادگار اجتماع میں فضا نعروں سے گونج اٹھی۔ اس اجتماع میں قائداعظم نے بلوچستان کے مسلمانوں کی خدمات اور قربانیوں کو بہت سراہا۔ بلوچستان کے مسلمانوں نے اس عزم کا اعادہ کیا کہ ہم پاکستان لے کر رہیں گے۔

۹۔جمعیت العلمائے بلوچستان کی خدمات: قیام پاکستان کے سلسلے میں بلوچستان کے علماء کرام نے نمایاں خدمات انجام دیں۔ انہوں نے اس ضمن میں علماء کی ایک جماعت قائم کی۔ جس کے ارکان قائداعظم سے سیاسی حالت پر گفتگو کے لئے ملاقات کرتے رہتے تھے۔ جمعیت العلماء نے آزادی کے لئے بلوچستان کے عوام کو تیار کیا اور قیام پاکستان کی حمایت کا اعلان پورے عزم کے ساتھ کیا۔ پس اس طرح بلوچستان کے مسلمانوں نے تحریک پاکستان میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور ان کے ساتھ مسلم طلباء نے بھی بہت کام کیا طلباء نے 1943ء میں بلوچستان مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن قائم کی۔ جس نے تحریک پاکستان میں نمایاں کردار ادا کیا۔

شمالی مغربی سرحدی صوبہ کا تحریک پاکستان میں کردار: شمالی مغربی سرحدی صوبہ کے نوجوانوں اور بزرگوں نے حصول آزادی کی کوششوں میں زبردست حصہ لیا وہ برطانوی حکومت کے خلاف چلائی جانے والی ہر تحریک میں ہراول دستے کا کردار ادا کرتے رہے۔ انگریزوں نے صوبہ سرحد کی سرزمین کو بے آئین بنا رکھا تھا اور یہاں کے مسلمانوں کو اقتصادی بدحالی میں مبتلا کر دیا تھا۔ مگر صوبہ سرحد کے غیور مسلمانوں نے ہمت نہ ہاری اور وہ مسلسل انگریزوں سے برسرپیکار رہے۔ انگریزوں نے ان پر مظالم ڈھائے۔ انہیں جیلوں میں ڈالا لیکن صد آفرین کہ انہوں نے شجاعت اور بلند حوصلگی کا دامن نہ چھوڑا۔ وہ اپنے دشمن کے پیچھے لگے رہے اور آزادی کی جدوجہد پورے طمطراق کے ساتھ جاری رکھی صوبہ سرحد کے مسلمان اس قدر نڈر تھے کہ جب اپریل 1947ء میں وائسرائے ہند نے سرحد کی سیاسی صورت حال کا جائزہ لینے کے لئے صوبہ سرحد کا دورہ کیا تو یہاں کے مسلمانوں نے وائسرائے ہند پر واضح کر دیا کہ سرحد کے مسلمان اور مسلم لیگ اپنے مقصد کے لئے ہر طرح کے حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہیں اور وہ اس مقصد کے لئے کسی اثر کو قبول نہیں کریں گے۔